01

An32R

رزم نامۂ انیسؔ

مراثیِ انیسؔ کے بہترین اقتباسات کی جدید ترتیب

رزمیہ، بیانیہ، رثائیہ شاعری کی معراج کمال

مولف و مرتبہ

پروفیسر سیّد مسعود حسن رضوی ادیبؔ

ناشر

کتاب نگر

دین دیال روڈ ○ لکھنؤ

پہلی چھاپ ۱۲۰۰

قیمت ... ... تین روپے

مطبوعۂ
سرفراز قومی پریس ، لکھنؤ

دیباچہ

میر انیس کے مرثیوں میں رزمی عناصر دیکھ کر اور اُن کے شاعرانہ کمال کا اندازہ کرکے میری طرح بہتوں کو یہ تمنّا ہوتی ہے کہ کاش اس شاعرِ اعظم نے کربلا کے عظیم واقعے پر ایک طویل رزمیہ نظم تصنیف کی ہوتی جو ہماری شاعری کی عظمت میں اضافہ کرتی اور جسے ہم دُنیا کی عظیم رزمیہ نظموں کے مقابلے میں پیش کر سکتے۔ میری یہی تمنّا آخر کار اِس کی متقاضی ہوئی کہ انیس کے مرثیوں سے مناسب اقتباسات منتخب کرکے اُنھیں اس طرح ترتیب دیا جائے کہ ایک مسلسل رزم نامہ وجود میں آجائے۔ یہ کام جتنا آسان اور سہل الحصول معلوم ہوتا تھا اتنا ہی دشوار اور صبر آزما نکلا۔ مناسب اقتباسات کی جستجو میں مراثیِ انیس کے ضخیم مجلدات کا بار بار مطالعہ کرنا پڑا، اور ان متفرق اقتباسات سے ایک مسلسل نظم مرتّب کرنے کی کوشش میں بڑی دماغ سوزی اور دیدہ ریزی کرنا پڑی، پھر بھی دل کی آرزو پوری نہ ہوئی۔ جی تو چاہتا تھا کہ یہ رزم نامہ بہترین مرثیوں کے بہترین اقتباسات پر مشتمل ہو۔ لیکن دقّت یہ آپڑی کہ واقعۂ کربلا کے چھوٹے بڑے متعدد اجزا ایسے ہیں جو کسی ایک ہی مرثیے میں ملتے ہیں، ایسے موقعوں پر انتخاب کی گنجائش ہی نہ تھی۔ مجبوراً کہیں کہیں پیشِ نظر معیار کو نظر انداز کرنا پڑا۔

انیس کا ہر مرثیہ ایک مستقل نظم ہے۔ ہر مرثیے کی ایک خاص فضا ہے۔ ایک ایک واقعہ اور ایک ایک منظر کئی کئی مرثیوں میں پیش کیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ ہر جگہ اس کے جزئیات میں ایسا تغیر کر دیا جائے کہ بیان میں تازگی آجائے اور سننے اور پڑھنے والوں میں سیری اور بے کیفی کا عالم پیدا نہ ہونے پائے۔ ان مختلف مضمونوں اور مختلف فضاؤں کے مرثیوں سے اقتباسات لے کر یہ رزم نامہ اس شرط کے ساتھ تیار کرنا تھا کہ اس کے اجزا میں کہیں تضاد، تناقض یا عدم مطابقت کا احساس نہ ہو اور اس کی فضا میں کیفیات کی گوناگونی، جذبات کی بوقلمونی اور مناظر کی رنگارنگی کے باوجود ایک عام یک رنگی اور ہمواری قائم رہے۔ یہ شرط پوری کرنے کی غرض سے کہیں کسی بیان کی جگہ بدلی گئی، کہیں ایک بیان کے اندر بندوں کی اور ایک بند کے اندر مصرعوں کی ترتیب بدلی گئی، کبھی ایک بند کے چار مصرعے کہیں سے اور بیت کہیں اور سے لی گئی، اور کہیں ایک مصرعے کی جگہ کسی دوسرے مصرعے کو دی گئی۔ کسی بند کو اس کی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھتے وقت ربط کلام اور مناسبت مقام کے تقاضے سے کبھی کبھی ایک دو لفظ اور دو چار جگہ جہاں اور کوئی صورت ممکن نہ تھی کوئی پورا مصرع بدلنا پڑا۔ غرض ہر ممکن ذریعے سے یہ کوشش کی گئی ہے کہ متفرق اجزا کا ایسا مجموعہ پیش کیا جائے جس میں جوڑ پیوند دکھائی نہ دیں۔

بعض لوگوں کو بعض بے نظیر اقتباسوں یا بندوں کو رزم نامے میں شامل نہ کرنے پر تعجب ہوگا۔ مجھے خود بعض چیزوں کو ترک کرنے کا افسوس ہے۔ مگر ان کا ترک کسی نہ کسی سبب سے ناگزیر تھا، مثلاً نظم کے کسی حصے سے مخالفت، یا نظم کی عام فضا سے منافرت، یا مضمون کی تکرار، یا بحر کا

اختلاف۔ ایک بات اور بھی ہے۔ مرثیے مجلسوں میں پڑھ کر دوسروں کو سنانے کے لیے ہیں اور یہ رزم نامہ خود پڑھنے کے لیے ہے۔ اس لیے اس میں وہ مقامات بھی نہیں لیے جا سکے جن میں سامعین سے خطاب ہے یا جن سے سامعین کی موجودگی ظاہر ہوتی ہے۔

انیس کے بیشتر مرثیے رزمی اور رثائی عناصر سے مرکب ہیں اور چونکہ اُن کا مقصد سامعین کے جذبات غم کو برانگیختہ کرنا ہے اس لیے ان میں اکثر بجا طور پر رثائی عناصر کا غلبہ نظر آتا ہے، غم انسان کا سب سے زیادہ قوی، سب سے زیادہ خالص اور سب سے زیادہ شریف جذبہ ہے اور انیس نے مرثیوں میں اس جذبے کی ترجمانی خوب خوب کی ہے۔ لیکن اس رزم نامے کا مقصد مرثیوں کے مقصد سے کچھ مختلف ہے۔ اس لیے اس میں رزمی اور رثائی عناصر کے امتزاج میں ایک خاص تناسب ملحوظ رکھا گیا ہے۔

بعض لوگوں کو مرثیوں میں اہل حرم کی گریہ و زاری کا بیان اُن کی شانِ صبر کے منافی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن قریب ترین عزیزوں کی موت پر رونا اور بین کرنا نسوانی بلکہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ اور اسی ذریعے سے اس کا سراغ ملتا ہے کہ امام حسینؑ کے اہلِ حرم کو اپنے عزیزوں سے کس حد کی محبت تھی۔ اس کے ساتھ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کی انتہائی محبت ادائے فرائض پر کبھی غالب نہیں آ سکی اور اُنھوں نے اپنے جگر کے ٹکڑوں اور آنکھوں کے تاروں کو تلواروں کے جنگل، نیزوں کے نیستان اور تیروں کی بارش میں بے تامل بلکہ بہ اصرار بھیج دیا تو ان کے بین اور بُکا سے اُن کی بے صبری ظاہر نہیں ہوتی بلکہ اُن کا صبر اور زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ اگر باپ، بھائی، شوہر اور بیٹے کی دائمی مفارقت پر ان کو غیر متاثر دکھایا جاتا تو صبر اور سنگ دلی میں امتیاز کیونکر ہوتا۔ اس نکتے کو ملحوظ رکھ کر اس رزم نامے میں بھی بین اور بُکا کو جگہ دی گئی ہے۔ لیکن یہ بین بھی ایسے ہیں کہ ان سے

خانوادۂ نبوت کی مخدرات عصمت کے بلند کردار کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

انیس نے واقعۂ کربلا کو کہیں ایک خانگی اور خاندانی سانحے کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور کہیں انسانی تاریخ کے ایک اہم اور عظیم واقعے کی حیثیت سے۔ اس رزم نامے میں مرثیوں کے اُن مقامات کو خاص طور پر جگہ دی گئی ہے جن سے واقعہ کربلا کی عالمی اور انسانی حیثیت نمایاں ہوتی ہے۔ انیس کے مرثیوں میں کہیں کہیں ایسی مافوق فطرت باتیں بھی نظر آجاتی ہیں جن کا تعلق محض معتقدات سے ہے۔ اس رزم نامے میں ایسی چیزیں نہ ہونے کے برابر ہیں، یعنی واقعۂ کربلا کو فلکی اور ملکی سطح پر نہیں بلکہ ارضی اور بشری سطح پر رکھا گیا ہے۔

یہ رزم نامہ جس طرح مرتب کیا گیا ہے اس کی مختصر روداد پیش کی جا چکی۔ اب اس میں جو خوبیاں نظر آئیں اُن کے لیے مصنف کا کمال داد کا مستحق ہے اور جو عیب دکھائی دیں اُن کی ذمہ داری مرتب کے سر ہے۔ لیکن امکان اس کا بھی ہے کہ کہیں کہیں کوئی لغزش مصنف کی بشریت کا ثبوت دے رہی ہو۔ حضرتِ انیس کو سہو و خطا سے کلیتہً مبرا ہونے کا دعویٰ نہیں۔ خود فرماتے ہیں

"جن سے خطا نہ ہو وہ ملک ہیں بشر نہیں"

آخر میں اس امر کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انیس کے مرثیوں سے ایک مسلسل رزمیہ نظم مرتب کرنے میں اولیت کا شرف منظور علی صاحب علوی کاکوری کو حاصل ہے، جنھوں نے ۱۹۱۵ء میں واقعات کربلا نام کی کتاب تالیف کی۔ اُس کتاب سے اس رزم نامے کا موازنہ مقصود نہیں؛ صرف اتنا کہنا ہے کہ ان دونوں کتابوں میں مماثلت بہت کم اور مغائرت بہت زیادہ ہے۔

سید مسعود حسن رضوی

لکھنؤ، ۲۷ فروری ۱۹۵۷ء

غلط نامۂ رزم نامۂ انیسؔ

صفحہ	بند	مصرع	غلط	صحیح
دیباچہ ص د		آخری سطر	منائرت	مغائرت
[illegible]	۴	۱	العلم	لاالعلم
[illegible]	۱	۲	نورنشاں	نورفشاں
[illegible]	۴	۶	یوصف	یوسف
[illegible]	۲	۳	شاد	شاہ
[illegible]	۴	۴	ہوائی	بھائی
[illegible]	۱	۱	چلے	اُٹھے
[illegible]	۴	۴	پاس	یاس
[illegible]	۲	۱	اُس	اِس
[illegible]	۵	۴	توے	تولے
[illegible]	۲	۵	فوج	فوجیں
[illegible]	″	۶	موج	موجیں
[illegible]	۳	۱	ماہ	شاہ
[illegible]	۱	۶	چاند	بدر
[illegible]	۲	۲	ڈانڈ	ڈانڈیں
[illegible]	۵	۲	کھاتے	کھائے
۹۲	۱	۳	ہوگیا	ہوگئے
۹۸	۱	۱	سمٹ کے یہ باگ	باگ غازی نے

صفحہ	بند	مصرع	غلط	صحیح
۹۹	۳	۲	غرابا	غربا
۱۰۲	۴	۳	خلام	غلام
۱۰۳	۳	۱	—	رعد تھرّا گیا
۱۰۸	۲	۵	حَور	حوؔر
۱۳۰	۲	۶	ازاز	انداز
۱۳۱	۴	۵	وہ	دو
۱۴۴	۱	۶	نضل	فضل
۱۵۸	۴	۳	ہیں	میں
۱۵۹	۵	۴	لے	بولے
۱۶۹	۳	۴	مصطفےٰ	مرتضےٰ
۱۸۶	۲	۱	—	سُنو اس طرف
۲۰۷	۱	۳	بھوں	سبھوں
۲۱۰	۲	۲	—	بھالے چھپے
۲۳۳	۲	۴	دہی	دہی ہی
۲۳۵	۲	۵	کے	سے
″	۳	۶	مسوڑے	مسوڑے
۲۳۶	۴	۶	کے	کی
۲۳۹	۲	۵	میرے	میری
۲۴۳	۲	۴	فور	کافور
۲۵۱	۳	۶	وہ	یہ
″	″	″	یہ	وہ

فہرست مضامین

رزم نامۂ انیسؔ

عظیم شاعر کا عظیم شاہکار

مُناجات

یارب! چمنِ نظم کو گلزارِ ارم کر
اے ابرِ کرم! خشک زراعت پہ کرم کر
تو فیض کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر
گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر
جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیمِ سخن میرے قلمرو سے نہ جائے

اس باغ میں چشمے ہیں ترے فیض کے جاری
بلبل کی زباں پر ہے تری شکر گزاری
ہر نخل برومند ہے یا حضرتِ باری
پھل ہم کو بھی مل جائے ریاضت کا ہماری
وہ گل ہوں عنایت چمنِ طبع نکو کو
بلبل نے بھی سونگھا نہ ہو جن پھولوں کی بو کو

غواصِ طبیعت کو عطا کر وہ لآلی
ہو جن کی جگہ تاج سرِ عرش پہ خالی
ایک ایک لڑی نظم ثریا سے ہو عالی
عالم کی نگاہوں سے گرے قطبِ شمالی
سب ہوں دُرِ یکتا نہ علاقہ ہو کسی سے
نذر ان کی یہ ہوں گے جنھیں رشتہ ہے نبی سے

بھر دے دُرِ مقصود سے اس دُرجِ دہاں کو
دریائے معانی سے بڑھا طبعِ رواں کو
آگاہ کر اندازِ تکلم سے زباں کو
عاشق ہو فصاحت بھی وہ دے حسنِ بیاں کو
تحسیں کا سموات سے غُل تا بہ سمک ہو
ہر گوش بنے کانِ ملاحت وہ نمک ہو

تعریف میں چشمے کو سمندر سے ملا دوں — قطرے کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں
ذرے کی چمک مہرِ منوّر سے ملا دوں — خاروں کو نزاکت میں گُلِ تر سے ملا دوں
گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

گر بزم کی جانب ہو توجّہ دمِ تحریر — کھنچ جائے ابھی گلشنِ فردوس کی تصویر
دیکھے نہ کبھی صحبتِ انجم فلکِ پیر — ہو جائے ہوا بزمِ سلیماں کی بھی توقیر
یوں تختِ حسینانِ معانی اُتر آئے
ہر چشم کو پریوں کا اکھاڑا نظر آئے

آؤں طرفِ رزم ابھی چھوڑ کے گر بزم — خیبر کی خبر لائے مری طبعِ اولوالعزم
قطعِ سرِ اعدا کا ارادہ ہو جو بالجزم — دکھلائے یہیں سب کو زباں معرکۂ رزم
جل جائیں عدو آگ بھڑکتی نظر آئے
تلوار پہ تلوار چمکتی نظر آئے

مصرعے ہوں صفِ آراصفتِ لشکرِ جرّار — الفاظ کی تیزی کو نہ پہنچے کوئی تلوار
نقطے ہوں جو ڈھالیں تو الف خنجرِ خونخوار — مد آگے بڑھیں برچھیوں کو تول کے اک بار
غُل ہو کبھی یوں فوج کو لڑتے نہیں دیکھا
مقتل میں اِن ایسا کبھی بڑھتے نہیں دیکھا

ہو ایک زباں ماہ سے تا مسکنِ ماہی — عالم کو دکھا دے بُرشِ سیفِ الٰہی
"جرأت کا دھنی تو ہے" یہ چلائیں سپاہی — "لاریب ترے نام پہ ہے سکّۂ شاہی"
ہر دم یہ اشارہ ہو دوات اور قلم کا
تو مالک و مختار ہے اس طبل و علم کا

ہو رتبۂ مدحِ حسنِ فاطمہ عالی — ہاں باندھ لوں گل دستۂ مضمونِ خیالی
ہر مصرع شاداب ہو اک پھولوں کی ڈالی — لفظوں کے بھی غنچے ہوں نزاکت سے نہ خالی
لب ریز لطافت سے ہو رنگینیِ سخن ایسا
رضواں بھی پکارے نہیں دیکھا چمن ایسا

اے باعثِ تخلیقِ جہاں! وقت مدد ہے — اے منتظمِ کون و مکاں! وقت مدد ہے
اے خضرِ رہِ گم شدگاں! وقت مدد ہے — اے حامیِ پیر و جواں! وقت مدد ہے
چلنا ہے دمِ تیغ دو دم پر کوئی دم کو
یوں ہاتھ پکڑ لے کہ نہ لغزش ہو قدم کو

مقبول دعا ہو گئی، غم دور ہوئے سب — امید بر آئی مری، حاصل ہوا مطلب
شامل ہوا افضالِ محمد، کرمِ رب — ہوتے ہیں علم فرجِ مضامیں کے نشاں اب
پشتی پہ ہیں سب رکن رکینِ دینِ مبیں کے
ڈنکے سے ہلا دیتا ہوں طبقوں کو زمیں کے

نازاں ہوں عنایت پہ شہنشاہِ زمن کی — بخشی ہے رضا جائزۂ فوجِ سخن کی
چہرے کی بحالی سے قبا چست ہے تن کی — لو بر طرفی پڑ گئی مضمونِ کہن کی
اک فرد پرانی نہیں دفتر میں ہمارے
بھرتی ہے نئی فوج کی لشکر میں ہمارے

ہے لعل و گہر سے یہ دہن کانِ جواہر — ہنگامِ سخن کھلتی ہے دکانِ جواہر
ہیں بند مرصع، تو ورق خوانِ جواہر — دیکھیں انھیں، ہاں، ہے کوئی خواہانِ جواہر؟
بینائے تو ماتِ ہنر چاہیے اس کو
سودا ہے جواہر کا نظر چاہیے اس کو

کیا ہو گئے، وہ جوہریانِ سخن اک بار — ہر وقت جو اس جنس کے رہتے تھے طلب گار
اب ہے کوئی طالب، نہ شناسا، نہ خریدار — ہے کون؟ دکھائیں کسے یہ گوہرِ شہوار
کس وقت یہاں چھوڑ کے ملکِ عدم آئے
جب اُٹھ گئے بازار سے گاہک تو ہم آئے

خواہاں نہیں یاقوتِ سخن کا کوئی گو آج — ہے آپ کی سرکار تو یا صاحبِ معراج!
اے باعثِ ایجادِ جہاں، خلق کے سرتاج! — ہو جائے گا دم بھر میں غنی بندۂ محتاج
اُمید اسی گھر کی، وسیلہ اسی گھر کا
دولت یہی میری، یہی توشہ ہے سفر کا

میں کیا ہوں، مری طبع ہے کیا، اے شہِ شاہاں! — حسان و فرزدق ہیں یہاں عاجز و حیراں
شرمندہ زمانے سے گئے دعبل و سحباں — قاصر ہیں سخن فہم و سخن سنج و سخن داں
کیا مدح کفِ خاک سے ہو نورِ خدا کی
لکنت یہیں کرتی ہیں زبانیں فصحا کی

اُعلیم و لاعلم کی کیا سحر بیانی — حضرت پہ ہویدا ہے مری ہیچ مدانی
نہ ذہن میں جودت، نہ طبیعت میں روانی — گویا ہوں، فقط ہے یہ تری فیض رسانی
میں کیا ہوں، فرشتوں کی طاقت ہے تو کیا ہے
وہ خاص یہ بندے ہیں کہ مدّاح خدا ہے

امام حسین کی ولادت

ہاں اے فلکِ پیر! نئے سر سے جواں ہو
اے ماہِ شبِ چاردہم! نور فشاں ہو
اے ظلمتِ غم! دیدۂ عالم سے نہاں ہو
اے روشنیٔ صبحِ شبِ عید! عیاں ہو
شادی ہو ولادت کی ید اللہ کے گھر میں
خورشید اترتا ہے شہنشاہ کے گھر میں

اے شمس و قمر! اور قمر ہوتا ہے پیدا
نخلِ چمنِ دیں کا ثمر ہوتا ہے پیدا
مخدومۂ عالم کا پسر ہوتا ہے پیدا
جو عرش کی ضو ہے وہ گہر ہوتا ہے پیدا
ہر جسم میں جان آتی ہے مذکور سے جس کے
نورِ خدا ہوں گے عیاں نور سے جس کے

اے کعبۂ ایماں! تری حرمت کے دن آئے
اے رکنِ یمانی! تری شوکت کے دن آئے
اے بیتِ مقدس! تری عزت کے دن آئے
اے چشمۂ زمزم! تری چاہت کے دن آئے
اے سنگِ حرم! جلوہ نمائی ہوئی تجھ میں
اے کوہِ صفا! اور صفائی ہوئی تجھ میں

اے یثرب و بطحا! ترے والی کی ہے آمد
اے رتبۂ اعلیٰ! شہِ عالی کی ہے آمد
عالم کی تغیری پہ بحالی کی ہے آمد
کہتے ہیں حسن ماہِ جلالی کی ہے آمد
یہ خانۂ کعبہ کی مباہات کے دن ہیں
یعقوب سے یوسف کی ملاقات کے دن ہیں

اے ارضِ مدینہ! تجھے فوق اب ہے فلک پر　　رونق جو سما پر ہے وہ اب ہو گی سمک پر
خورشید ملا، تیرا ستارہ ہے چمک پر　　صدقے گلِ جنت ترے پھولوں کی مہک پر

پر جس پہ فرشتوں کے بچھیں، فرش وہی ہے
جس خاک پہ ہو نورِ خدا، عرش وہی ہے

یا ختمِ رسل! گوہرِ مقصود مبارک　　یا نورِ خدا! رحمتِ معبود مبارک
یا شاہِ نجف! شادیِ مولود مبارک　　یا خیرِ نسا! اخترِ مسعود مبارک

رونق ہو سدا، نور دوبالا رہے گھر میں
اس ماہِ دو ہفتہ کا اُجالا رہے گھر میں

اے ماہِ معظم! ترے اقبال کے صدقے　　شوکت کے فدا، عظمت و اجلال کے صدقے
اُتری برکت، فاطمہ کے لال کے صدقے　　جس سال یہ پیدا ہوئے اُس سال کے صدقے

قرباں سحرِ عید اگر ہو تو بجا ہے
نوروز بھی اس شب کی بزرگی پہ فدا ہے

قربانِ شبِ جمعۂ شعبانِ خوش انجام　　پیدا ہوا جس شب کو محمد کا گلِ اندام
قائم ہوا دیں، اور بڑھی رونقِ اسلام　　ہم پلّۂ صبحِ شبِ معراج تھی وہ شام

خورشید کا اجلال و شرف بدر سے پوچھو
کیا قدر تھی اس شب کی، شبِ قدر سے پوچھو

روشن تھا مدینے کا ہر اک کوچہ و بازار　　جو راہ تھی خوشبو، جو محلّہ تھا وہ گلزار
کھولے ہوئے تھا آہوئے شب نافۂ تاتار　　معلوم یہ ہوتا تھا کہ پھولوں کا ہے انبار

گردوں کو بھی اک رشک تھا زینت پہ زمیں کی
ہر گھر میں ہوا آتی تھی فردوس بریں کی

ناگاہ درِ حجرہ ہوا مطلعِ انوار — دکھلانے لگے نورِ تجلّی در و دیوار
اسما نے علی سے یہ کہا دوڑ کے اک بار — "فرزند مبارک تمھیں یا حیدرِ کرار!
اسپند کرو فاطمہ کے ماہ جبیں پر
فرزند نہیں، چاند یہ اترا ہے زمیں پر

"دیکھا نہیں اس طرح کا چہرہ کبھی پیارا — نقشہ ہے محمد سے شہنشاہ کا سارا
ماتھے پہ چمکتا ہے جلالت کا ستارا — اللہ نے اس گھر میں عجب چاند اتارا
تصویرِ رسولِ عربی دیکھ رہے ہیں
آنکھوں کی ہے گردش کہ نبی دیکھ رہے ہیں"

مژدہ یہ سنا احمدِ مختار نے جس دم — بس شکر کے سجدے کو جھکے قبلۂ عالم
آئے طرفِ خانۂ زہرا خوش و خرم — فرمایا "مبارک پسر اے ثانیِ مریم!
چہرہ مجھے دکھلاؤ مرے نورِ نظر کا
ٹکڑا ہے یہ فرزند محمد کے جگر کا"

کی عرض یہ اسما نے کہ "اے خاصۂ داور! — نہلالوں تو لے آؤں اسے حجرے سے باہر"
ارشاد کیا احمدِ مختار نے ہنس کر — "لے آ کہ نواسا ہے مرا طاہر و اطہر
اس چاند کو تاجِ سرِ افلاک کیا ہے
یہ وہ ہے خدا نے جسے خود پاک کیا ہے

"میں اس سے ہوا اور مجھ سے ہے یہ، تو نہیں ماہر — یہ نورِ الٰہی ہے، یہ ہے طیب و طاہر
اسرار جو مخفی ہیں، وہ اب ہوویں گے ظاہر — یہ آیتِ ایماں ہے، یہ ہے حجتِ باہر
بڑھ کر مددِ سیدِ لولاک کرے گا
کفار کے قصے کو یہی پاک کرے گا"

جس دم یہ خبر مخبرِ صادق نے سنائی — اسماؑ اُسے اک پارچۂ نرم پہ لائی
بو اُس گلِ تازہ کی محمدؐ نے جو پائی — ہنسنے لگے، سُرخی رُخِ پُرنور پہ آئی
مُنہ چاند سا دیکھا جو رسولِ عربیؐ نے
لپٹا لیا چھاتی سے نواسے کو نبیؐ نے

جان آگئی یعقوب نے یوسف کو جو پایا — قرآں کی طرح رحلِ دو زانو پہ بٹھایا
مُنہ ملنے لگے مُنہ سے، بہت پیار جو آیا — بوسے لیے اور ہاتھوں کو آنکھوں سے لگایا
دل ہل گیا، کی جب کہ نظر حلقِ پسر پر
چوما جو گلا، چل گئی تلوار جگر پر

جوش آیا تھا رونے کا، مگر تھام کے رقت — اِس کان میں فرمائی اذاں، اُس میں اقامت
حیدرؑ سے یہ فرمایا کہ "اے شاہِ ولایت! — کیوں تم نے بھی دیکھی مرے فرزند کی صورت؟
پُرنور ہے گھر، تم کو ملا ہے قمر ایسا
دُنیا میں کسی نے نہیں پایا پسر ایسا

کیونکر نہ ہو، تم سا پدر اور فاطمہ سی ماں، — دو شمس و قمر کا ہے یہ اِک نیّرِ تاباں"
کی عرض یہ حیدرؑ نے کہ "اے قبلۂ ایماں! — حق اس پہ رکھے سایۂ پیغمبرِ ذی شاں
اعلیٰ ہے وہ سب سے جو مقامِ شہِ دیں ہے
بندہ ہوں میں اور یہ بھی غلامِ شہِ دیں ہے

عالم میں ہے یہ سب برکت آپ کے دم سے — سرسبزی دنیا ہے اسی ابرِ کرم سے
تا عرش پہنچ جاتا ہے سر فیضِ قدم سے — عزت ہے غلاموں کی شہنشاہِ اُمم سے
کچھ اس میں نہ زہرا کا ہے باعث نہ علیؑ کا
بس ہے یہ بزرگی کہ نواسا ہے نبیؐ کا"

کیا عشق تھا شبیر سے محبوبِ خدا کو ! — کیا چاہتے تھے ابنِ بتولِ عذرا کو !
اک دم نہ جدا کرتے تھے اُس ماہ لقا کو — چھاتی پہ لٹاتے تھے شہ کرب و بلا کو
یہ حال تھا اُلفت سے رسولِ عربی کا
رونا نہ گوارا تھا حسین ابنِ علی کا

گودی میں کبھی، اور کبھی زانو پہ بٹھاتے — نیند آتی، تو آغوشِ مبارک میں سُلاتے
شفقت سے کبھی جھولے کی ڈوری کو ہلاتے — جھولے سے اٹھا کر کبھی کاندھے سے لگاتے
منہ چومتے تھے، بوسۂ رُخ لیتے تھے حضرت
انجام کا دھیان آتا تو رو دیتے تھے حضرت

خاتونِ قیامت سے یہ فرماتے تھے اکثر — "شبیر کے رونے سے قلق ہوتا ہے دل پر
زہرا! اِسے چھاتی سے جدا کیجو نہ دم بھر — ٹکڑا ہے کلیجے کا مرے یہ ترا دلبر
بے چین یہ ہوگا، تو اذیت مجھے ہوگی
راحت اِسے پہنچے گی تو راحت مجھے ہوگی

اے فاطمہ! یہ عرشِ الٰہی کا ہے تارا — پیارا ہے جنابِ احدی کا ترا پیارا
یہ لال ہے فرزندِ جگر بند ہمارا — رنج اس کا محمد کو نہ ہوئے گا گوارا
ہنستا ہے جو یہ، دل مرا کھل جاتا ہے زہرا!
رونے سے جگر سینے میں ہل جاتا ہے زہرا!

"یہ شمعِ ہدایت ہے، یہ ہے خاصۂ باری — دوزخ سے بچائے گا یہ اُمت کو ہماری
ایذا مرے بعد اس کو بہت دیں گے ناری — بیٹا! مرے کام آئے گی دولت یہ تمہاری
کیا کیا کہوں جو مجھ پہ یہ احسان کرے گا
سب گھر مری اُمت پہ یہ قربان کرے گا"

دُنیا بھی عجب گھر ہے کہ راحت نہیں جس میں — وہ گُل ہے یہ گُل، بوئے محبت نہیں جس میں
وہ دوست ہے یہ دوست، مروت نہیں جس میں — وہ شہد ہے یہ شہد، حلاوت نہیں جس میں
بے درد و الم شام غریباں نہیں گزری
دُنیا میں کسی کی کبھی یکساں نہیں گزری

گودی ہے کبھی ماں کی، کبھی قبر کا آغوش — گُل پیرہن اکثر نظر آتے ہیں کفن پوش
سرگرم سخن ہے کبھی انساں، کبھی خاموش — گہ تخت ہے اور گاہ جنازہ بسر دوش
اِک طور پہ دیکھا نہ جواں کو نہ مُسن کو
شب کو تو چھپر کٹ میں ہیں، تابوت میں دن کو

شادی ہو کہ اندوہ ہو، آرام ہو یا جوَر — دُنیا میں گزر جاتی ہے انساں کی ہر طور
ماتم کی کبھی فصل ہے، عشرت کا کبھی دَور — ہے شادی و ماتم کا مُرقع جو کرو غور
کس باغ پہ آسیب خزاں آ نہیں جاتا
گُل کون سا کھلتا ہے جو مُرجھا نہیں جاتا

کس کس گُلِ رنگیں کی نہ اس باغ میں تھی دھوم — اِک آن میں شبنم کی طرح ہو گئے معدوم
دکھلا رہی ہے رنگ عجب ہستیِ موہوم — کیا قصد ہے گلچینِ اجل کا نہیں معلوم
اس باغ میں جب سرو کو دیکھا وہ رواں ہے
جس گُل پہ بہار آج ہے، کل اُس پہ خزاں ہے

ہے عالمِ فانی کی عجب صبح، عجب شام — گہ غم ہے کبھی شادی، کبھی ایذا، کبھی آرام
نازوں سے پلا فاطمہ زہرا کا گُلِ اندام — واحسرت و دردا! کہ یہ آغاز وہ انجام
راحت نہ ملی گھر کے تلاطم سے دہم تک
مظلوم نے فاقے کیے ہفتم سے دہم تک

بیعت کا سوال اور امام حسین کا انکار

جس دم یزید شام میں مسند نشیں ہوا
سب ملک رو سیاہ کے زیر نگیں ہوا
شبیر سے زیادہ اُسے بغض و کیں ہوا
ایذائے اہلِ بیت کے درپے لعیں ہوا
کہتا تھا، سلطنت کا تو ساماں درست ہے
سختی نہ ان پہ ہو، تو ریاست یہ سست ہے

خط حاکمِ مدینہ کو لکھا بہ شد و مد
مضموں یہ تھا کہ تب ہو اطاعت تری سند
بیعت مری حسین سے لے تو بہ جد و کد
میں فوج بھیجتا ہوں کرے گی تری مدد
بیعت کریں، تو جلد اِدھر بھیج دیجیو
راضی نہ ہوں تو کاٹ کے سر بھیج دیجیو

پہنچا اُسے مدینے میں جب نامۂ یزید
پڑھ کر وہ خط بہت متردد ہوا ولید
دل سے کہا، یہ ظلم تو ہے عقل سے بعید
میں فاطمہ کے لال کو کیوں کر کروں شہید
دعویٰ سلطنت بھی نہیں، بے قصور ہے
ایسے کنارہ کش پہ ستم کیا ضرور ہے

آخر کسی کو بھیج کے شہ کو کیا طلب
بھائی، بھتیجے، شاہ کے حاضر تھے سب کے سب
فرمایا اُس سے "جا کہ میں آؤں گا وقتِ شب
معلوم ہے مجھے جو بلانے کا ہے سبب
سب جانتے ہیں بیعتِ فاسق حرام ہے
اُس کی طلب نہیں یہ اجل کا پیام ہے"

گھبرا گئے یہ سن کے عزیز و رفیق دیار — قاسم نے رکھ لی سامنے شمشیر آب دار
اکبر نے بھی طلب کیا اسباب کارزار — آئے بکمال غیظ میں عباس ذی وقار
کہہ کر یہ بات صورت شیر اُٹھ کھڑے ہوئے
"حاکم کے گھر نہ جائیں گے ہم بے لڑے ہوئے"

زینب کے دونوں بیٹوں کو اُس دم رہی نہ تاب — جا کر حرم سرا میں کہا با صد اضطراب
"حاکم کے گھر میں جاتے ہیں شاہ فلک جناب — اماں! ہمارے تیغ لا دیجے شتاب
جھگڑے گی گر تو خون کے دریا بہائیں گے
کام آج بھی نہ آئے، تو کس کام آئیں گے"

سُن کر سخن یہ ہو گیا زینب کا رنگ زرد — آنسو بھر آئے آنکھوں میں، اُٹھا جگر میں درد
بولیں کلیجہ تھام کے اور بھر کے آہ سرد — "کیا والیِ مدینہ ہوا آمادۂ نبرد؟
ایسی علی کے لال سے تقصیر کیا ہوئی
کیا جرم، کیا گناہ ہوا، کیا خطا ہوئی

"بھائی کو میرے پاس بلا دو، سنوں یہ حال — کیا بات ہے، جو خاطرِ اقدس پہ ہے ملال
تنہا چلا نہ جائے کہیں فاطمہ کا لال — ہوائی پہ کچھ بنے گی تو کھولوں گی سر کے بال
شاید دغا ہو، جنگ کا ساماں کیے چلیں
حاکم کے گھر میں ساتھ مجھے بھی لیے چلیں"

باتیں یہ ہو رہی تھیں کہ آ کے امام دیں — منہ دیکھ کر شہ کا رو نے لگیں زینب حزیں
فرمایا شہ نے روتی ہو کیوں، خوف کچھ نہیں — حاکم کے گھر میں جائے گا حیدر کا جانشیں
وہ اور ہیں جگہ تمہیں جس کا خیال ہے
یاں مجھ پہ ہاتھ اُٹھائے کوئی، کیا مجال ہے"

کھا چکے بہن کو جو حضرتِ چشم تر — باندھی شہِ نجف کے کمربند سے کمر
ڈالا عبائے پاکِ محمد کو دوش پر — لے کر عصا نبی کا چلے شاہِ بحر و بر
یوں ساتھ تھے عزیز شہِ کم سپاہ کے
جیسے ستارے چرخ پہ ہوں گرد ماہ کے

اُس دم کمال حضرتِ زینب تھیں بے قرار — بیت الشرف سے جاتی تھیں ڈیوڑھی پہ بار بار
عباس سے بُلا کے کہا "اے وفا شعار! — بھائی کو چھوڑیو نہ اکیلا بہن نثار
حاکم سے ہم سخن جو شہِ خوش خصال ہوں
تم اک طرف ہو ایک طرف میرے لال ہوں"

یہ بات کہہ کے رونے لگی وہ جگر کباب — چالیس شخص لے کے چلا ابنِ بوتراب
جو دیکھتا تھا شانِ امامِ فلک جناب — کہتا تھا وہ کہ رات کو نکلا ہے آفتاب
رستے میں شب کو حُسنِ نبی کا ظہور تھا
افلاک کم زمیں کے ستاروں کا نور تھا

حاکم کے در پہ پہنچے، تو کہنے لگے امام — "تم سب رہو یہیں، کہ نہیں یاں تمھارا کام
پر جب کروں پکار کے حاکم سے میں کلام — "دوڑ آنا آئیو، کہ مدد کا ہے وہ مقام
گھبراتے اتنا کیوں ہو کہ میں بے قصور ہوں
تم ہو نہ مجھ سے دور، نہ میں تم سے دور ہوں"

پاسِ ادب سے کہہ نہ سکے کچھ رفیق و یار — بولے یہ ہاتھ جوڑ کے عباسِ نامدار
"دل کو غلام کے نہیں آئے گا یاں قرار — سائے کی طرح ساتھ نہ چھوڑے گا جاں نثار
شاید نہ پہنچے یاں تلک آواز دور کی
کفشیں لیے رہے گا یہ خادم حضور کی"

سمجھا کے بھائی کو گئے حاکم کے پاس شاہ — اُس نے کہا "معاویہ نے لی عدم کی راہ

پڑھیے خطِ یزید کو اے شاہِ دیں پناہ!" — پڑھ کر وہ خط امام نے کھینچی جگر سے آہ

فرمایا "سر کٹے تو کٹے کچھ الم نہیں،

لیکن کریں جو بیعتِ فاسق وہ ہم نہیں

"ہم ہیں ستونِ دین و نشانِ رہِ یقیں — خالق نے اپنے راز کا ہم کو کیا امیں

واللہ! ہم ہیں وارثِ سردارِ مرسلیں — روشن ہمارے نورِ امامت سے ہے زمیں

گردش سے گو زمانے کی مظلوم آج ہیں

فضلِ خدا سے عرشِ الٰہی کے تاج ہیں

"ابنِ معاویہ ہے بد اطوار و خیرہ سر — مے خوار و فتنہ ساز و دل آزار و اہلِ شر

بے دین و بے یقین و بد آئین و بد گہر — نہ دیں سے فیض یاب ایماں سے بہرہ ور

ہر جا فجور و فسق کا جس کے فسانہ ہو

ایسے کا زیرِ دست امامِ زمانہ ہو!"

یہ کہہ کے اُٹھ کھڑے ہوے شاہِ ذوالاحترام — قبرِ رسول پر اُسی شب کو گئے امام

لپٹے ضریحِ پاک سے، اور یہ کیے کلام — "رخصت کرو حسین کو یا سیدِ انام!

تربت میں لے کے جلد لگا لیجے سینے سے

اعدا نکالے دیتے ہیں مجھ کو مدینے سے

ترکِ وطن کا قصد

"حضرت کی قبر چھوٹتی ہے مجھ سے نانا جاں! — میں بچ سکوں جہاں، کوئی ایسا نہیں مکاں

آرام سے گھروں میں ہیں سب زیرِ آسماں — فریاد ہے، حسین کو ملتی نہیں اماں

ناموس کو حضور کے کس جا بٹھاؤں میں

بچوں کو اس تپش میں کہاں لے کے جاؤں میں"

امامِ حسینؑ کا سفر

سفر کی صعوبتیں

ہوتے ہیں بہت رنج مسافر کو سفر میں
راحت نہیں ملتی کوئی دم آٹھ پہر میں
تو شغل ہوں، پر دھیان لگا رہتا ہے گھر میں
پھرتی ہے سدا شکل عزیزوں کی نظر میں
سنگِ غمِ فرقت دلِ نازک پہ گراں ہے
اندوہِ غریب الوطنی کاہشِ جاں ہے

گو راہ میں ہمراہ بھی ہو راحلہ و زاد
جاتی نہیں افسردگیِ خاطرِ ناشاد
جب عالمِ تنہائی میں آتا ہے وطن یاد
ہر گام پہ دل مثلِ جرس کرتا ہے فریاد
اک آن غم و رنج سے فرصت نہیں ملتی
منزل پہ بھی آرام کی صورت نہیں ملتی

ہمراہ سفر میں ہوں اگر حامی و ناصر
منزل پہ کمر کھول کے سوتے ہیں مسافر
جب ہو سفرِ خوف و پریشانیِ خاطر
شب جاگتے ہی جاگتے ہو جاتی ہے آخر
ہر طرح مسافر کے لیے رنج و تعب ہے
رہ جائے پسِ قافلہ تھک کر تو غضب ہے

دکھ دیتے ہیں ایک ایک قدم پاؤں کے چھالے
منزل پہ پہنچنے کے بھی پڑ جاتے ہیں لالے
ہاتھوں سے اگر بیٹھ کے کانٹوں کو نکالے
ڈر ہے کہ نہ بڑھ جائیں کہیں قافلے والے
واماندوں کے لینے کو بھی آتا نہیں کوئی
تھک کر کبھی بیٹھے تو اٹھاتا نہیں کوئی

کتنے ہیں مسافر کہ نہ پھر آئے سفر سے — جنگل میں عزیزوں کو اجل لے گئی گھر سے
رُک جاتی ہے شمشیر کی ضرب تو سپر سے — ساعت وہ اجل کی ہے کہ ٹلتی نہیں سر سے
کتنے ہیں مسافر کہ تہِ خاک نہاں ہیں
قبریں تو ہیں ویرانے میں بستی میں مکاں ہیں

دشمن کو بھی اللہ چھڑائے نہ وطن سے — جانے وہی بلبل جو بچھڑ جائے چمن سے
واقف ہے مسافر کا دل اس رنج و محن سے — چھٹتا نہیں گھر جان نکل جاتی ہے تن سے
آرام کی صورت نہیں مسکن سے بچھڑ کر
طائر بھی پھڑکتا ہے نشیمن سے بچھڑ کر

غربت کی بھی ہوتی ہے عجب صبح عجب شام — کرتا ہے سفر قافلۂ راحت و آرام
وہ دشت نوردی وہ غم و صدمہ و آلام — منزل پہ بھی ممکن نہیں راحت کا سرانجام
نیند آتی ہے کب لاکھ جو پٹکے وہ سر اپنا
یاد آتا ہے منزل پہ مسافر کو گھر اپنا

کنعانِ محمد کے حسینوں کا سفر ہے — خورشید لقا زہرہ جبینوں کا سفر ہے
چھٹتا ہے وطن گوشہ نشینوں کا سفر ہے — اک دن کا نہیں کوچ مہینوں کا سفر ہے
گل رو چمنِ دہر سے جلنے کو چلے ہیں
گھر چھوڑ کے جنگل کے بسانے کو چلے ہیں

سفر کی تیاریاں

گردش پہ اب اور فاطمہ زہرا کا قمر ہے — ایک ایک قدم راہ میں لٹ جانے کا ڈر ہے
بستی ہے نہ رستے میں کسی جا نہ شجر ہے — درپیش ہے سختی کہ پہاڑوں کا سفر ہے
گرمی میں گرفتارِ محن ہوتے ہیں شبیر
بچے لیے آوارہ وطن ہوتے ہیں شبیر

اس فصل میں ہے نہضتِ فرزندِ پیمبر　　جن روزوں پکھیرو بھی نہیں چھوڑتے ہیں گھر
اندھیر ہے، خاک اڑتی ہے، لو چلتی ہے دن بھر　　جھیلوں سے پرندے بھی نکلتے نہیں باہر
یہ دھوپ میں حدت ہے کہ سب گوشہ نشیں ہیں
سایہ کہاں، پتے بھی درختوں میں نہیں ہیں

وہ لو، وہ تپش، اور وہ گرمی کا مہینا　　سردی میں ہو ذکر اس کا، تو آ جائے پسینا
دشوار ہے اس دھوپ میں معصوموں کا جینا　　ویرانہ ہے بستی میں، اجڑتا ہے مدینا
حضرت بھی گھلے جاتے ہیں تشویشِ سفر سے
ہیں ساتھ وہ بچے بھی جو نکلے نہیں گھر سے

مدینے والوں کی بے چینی

برپا ہے مدینے میں تلاطم کئی دن سے　　ہے راحت و آرام و طرب گم کئی دن سے
ہر گھر میں ہے اک شورِ تظلّم کئی دن سے　　منھ ڈھانپے ہوئے روتے ہیں مردم کئی دن سے
وہ غم ہے، کہ آرام کا جویا نہیں کوئی
راتیں کئی گزری ہیں کہ سویا نہیں کوئی

یثرب کے زن و مرد ہیں سب بے خور و بے خواب　　شبیر کی فرقت کی کسی دل کو نہیں تاب
ہمسائے میں اک غل ہے، بکا کرتے ہیں احباب　　غل ہے کہ مدینے میں خوشی اب ہوئی نایاب
اس شاہ میں خو بو ہے شہِ عقدہ کشا کی
اب کون خبر راتوں کو لے گا فقرا کی

شب سے ہیں تردد میں سفر کے شہِ ابرار　　عباس نکلواتے ہیں صندوقوں سے ہتھیار
اسبابِ سفر باندھتے ہیں یاور و انصار　　گھوڑے بھی کسے جاتے ہیں، محمل بھی ہیں تیار
ہر محمل و ہودج پہ گھٹاٹوپ پڑے ہیں
پردے کی قناتیں لیے فراش کھڑے ہیں

خلقت کا ہے مجمع درِ دولت پہ سحر سے — جو آتا ہے، روتا ہوا آتا ہے وہ گھر سے
سب کہتے ہیں برسا کے لہو دیدۂ تر سے — "چھپ جائے گا اب فاطمہ کا چاند نظر سے
اندھیر ہے گر یہ شہ والا نہ رہے گا
اب شہر کی گلیوں میں اُجالا نہ رہے گا"

کہتے ہیں جوانانِ مدینہ یہی رو کر — "اب ہم سے بچھڑ جائیں گے ہے ہے علی اکبر"
بے تاب ہیں احباب علمدارِ دلاور — روتا ہوا گرتا ہے کوئی آ کے قدم پر
ہر مرتبہ اشک آنکھوں میں بھر لاتے ہیں عباس
چھاتی سے ہر اک دوست کو لپٹاتے ہیں عباس

قاسم کے جو ہم سن ہیں وہ سب کرتے ہیں زاری — ایک ایک پہ اندوہ و غم و رنج ہے طاری
کہتے ہیں کہ "اب تلخ ہوئی زیست ہماری — کیا ہوگا چلی جائے گی جس وقت سواری
جب آئیں گے یاں نالہ و فریاد کریں گے
سب روئیں گے جب خُلقِ حسنؑ یاد کریں گے"

ہم جولیوں کا عون و محمد کے یہ ہے حال — بے تاب ہیں سب روتے ہیں اس درد سے اطفال
ایک ایک سے فرماتے ہیں وہ صاحبِ اقبال — "بس بھائیو بس، رو رو کے آنکھیں نہ کرو لال
عزّت ہے اطاعت میں امامِ دوسرا کی
پھر آئیں گے گر زیست نے اس سال وفا کی"

در پر کوئی روتا ہے، کوئی راہ گزر میں — تاریک ہے دُنیا، کسی غم گیں کی نظر میں
ہیں جمع محلّے کی جو سب بی بیاں گھر میں — اک حشر ہے ناموسِ شہِ جن و بشر میں
سب مل کے بکا کرتی ہیں، جب آتا ہے کوئی
یوں روتی ہیں، جس طرح کہ مر جاتا ہے کوئی

سب کہتی ہیں زینب سے کہ "اے شاہ کی شیدا! کیوں چھوڑ چلیں ہم کو یکایک یہ ہوا کیا؟
پانی کی کمی، گرمی کے دن، خوف کا رستا، وہ دھوپ پہاڑوں کی، وہ لو، اور وہ صحرا
کیا سوچ کے اس فصل میں شبیر چلے ہیں
بچوں پہ کرو رحم، کہ نازوں کے پلے ہیں

"سنتے ہیں یہ ہر وارد و صادر کی زبانی جھیلوں میں بھی نہروں میں بھی سب خشک ہے پانی
اس فصل میں ہوتی ہے بہت تشنہ دہانی کس طرح جئیں گے اسداللہ کے جانی
تونسا ہوا بچہ کبھی جاں بر نہیں ہوتا
جب خشک ہوا پھول تو پھر تر نہیں ہوتا

"ہیہات کہ ننھے سے بھی بچے کا سفر ہے کچھ تم کو پہاڑوں کی بھی گرمی کی خبر ہے؟
غربت میں جوانوں کے تلف ہونے کا ڈر ہے رحم اس پہ ہے لازم، کہ یہ بچہ گل تر ہے
صغرا کو جدا دکھ ہے، قلق ماں کو جدا ہے
گرمی کے سبب دم جو گھٹ جائے تو کیا ہو"

فرماتی تھیں زینب "نہیں بہنو! کوئی چارا قسمت میں تباہی ہے، تو کیا زور ہمارا
گھر چھوڑ کے جانا بھی کسی کو ہے گوارا؟ مجبور ہے، مضطر ہے، یداللہ کا پیارا
ایام مصیبت کے ہیں، تنہائی کے دن ہیں
غربت کی شبیں، بادیہ پیمائی کے دن ہیں"

باتیں یہ ابھی تھیں، کہ شہ بحر و بر آئے دیکھا رخ ہمشیر کو اور اشک بہائے — فاطمہ صغرا
ماں بیٹھی تھی صغرا کو جو چھاتی سے لگائے روتے ہوئے تشریف شہ دیں وہیں لائے — سے رخصت
بیٹی شہ ذی جاہ کی تعظیم کو اٹھی
بستر سے عصا تھام کے تسلیم کو اٹھی

جلد اُس کے قریب آن کے کہنے لگے حضرت — "بیٹھو کہ ابھی اُٹھنے کی تم میں نہیں طاقت
اِک ضعف کی تصویر ہو، اتنی ہے نقاہت — کیوں رات کو کیسی رہی بی بی کی طبیعت؟
تپ میں جو کراہی تھیں، تو گھبرائے تھے صغرا
بے ہوش تھیں تم، شب کو جو ہم آئے تھے صغرا

"ایسا سفرِ صعب اور اس طرح کا بیمار! — ڈر ہے کہ نہ بڑھ جائے کہیں راہ میں آزار
کیا نرگسی آنکھوں سے نقاہت ہے نمودار! — سب زرد ہے ازمانِ حرارت سے تن زار
حمّی سے یہ کسی روز بحالی نہیں پاتا
مُدّت سے کبھی نبض کو خالی نہیں پاتا

"دم چڑھتا ہے، بستر سے اُٹھاتی ہو اگر سر — بی بی کہو محمل میں چڑھا جائے گا کیونکر
گھر میں تمہیں پانی کی بھڑک رہتی ہے دن بھر — پھر کیا ہو کسی دن جو نہ پانی ہو میسر؟
تم جانے کے قابل نہیں، میں رہ نہیں سکتا
شب سے ہے وہ تشویش کہ کچھ کہہ نہیں سکتا

"گھر میں تمہیں چھوڑوں، یہ نہیں دل کو گوارا — لے جاؤں، تو بچنا نہیں ممکن ہے تمہارا
بچوں میں کوئی تم سے زیادہ نہیں پیارا — مجبور ہوں، بے ہجر نہیں اب کوئی چارا
فرقت میں سدا نالہ و فریاد کروں گا
اُتروں گا جو منزل پہ تمہیں یاد کروں گا"

صغرا نے کہا "آپ کی اُلفت کے میں قرباں — پھر کس کو ہو، گر آپ کو لونڈی کا نہ ہو دھیاں
صدقے گئی صحت کا بھی ہو جائے گا ساماں — مولا کی توجہ ہے ہر اک درد کا درماں
جس پر نظرِ لطفِ مسیحِ دوسرا ہو
برسوں کا ہو بیمار تو اک دم میں شفا ہو

"قربان گئی، اب تو بہت کم ہے نقاہت ‏ تپ کی بھی ہے شدت میں کئی روز سے خفت
بستر سے میں خود اُٹھ کے ٹہلتی بھی ہوں حضرت ‏ پانی کی بھی خواہش ہے غذا کی بھی ہے رغبت
حضرت کی دُعا سے مجھے صحت کا یقیں ہے
اب تو مرے منہ کا بھی مزہ تلخ نہیں ہے

"مرجاؤں گی، بچھڑی جو مسیحِ دوسرا سے ‏ صحت مجھے ہو جائے گی حضرت کی دُعا سے
کٹ جائے گا اندوہِ سفر فضلِ خدا سے ‏ بیمار میں جان آئے گی جنگل کی ہوا سے
سب ساتھ ہیں، روؤں گی نہ غم کھاؤں گی بابا
لیٹی ہوئی محمل میں چلی جاؤں گی بابا"

شہ نے کہا "تم حال سے میرے نہیں آگاہ ‏ مجبور نکلتا ہوں میں اس شہر سے واللہ!
آفت کا ہے بی بی یہ سفر، خوف کی ہے راہ ‏ بیمار ہو کس طرح میں لے جاؤں تمھیں آہ!
آزار رسیدہ ہوں، گرفتارِ بلا ہوں
گھر چھوڑ کے جلادوں کی سرحد میں چلا ہوں

"وہ صعب پہاڑوں کا سفر، اور وہ کڑے کوس ‏ دن رات مسافر پہ کبھی دھوپ، کبھی اوس
ایک ایک قدم رنج و الم، حسرت و افسوس ‏ ہوتا نہیں جز خار کوئی آ کے قدم بوس
آرام کہیں راہ میں جانی نہیں ملتا
جنگل ہے وہ پُر ہول کہ پانی نہیں ملتا

"تھوڑے ہی دنوں ہوئے گی کنبے سے جدائی ‏ پردیس سے آکر تمھیں لے جائیں گے بھائی
کی مجھ سے نہ گر کوفے کی خلقت نے بُرائی ‏ ممکن ہے کہ مل جاؤں نہ کروں وعدہ وفائی؟
خوش ہوں گا، تم اب دل پہ اگر جبر کرو گی
مرجاؤں گا جب میں، تو نہ کیا صبر کرو گی؟"

ثابت ہوا صغرا یہ کہ اب ہم رہے گھر میں
بس پھر گئی تنہائی کی تصویر نظر میں
اک جوش ہوا آنسوؤں کا دیدۂ تر میں
صدمے سے کھٹک درد کی پیدا ہوئی سر میں
شکل اپنی شبِ ہجر جو دکھلا گئی اُس کو
کانپا یہ تنِ زار کہ تپ آ گئی اُس کو

تھرّاتی ہوئی اُٹھ کے گری شہ کے قدم پر
کی عرض کہ "مر جاؤں گی یا سبطِ پیمبر!
تنہائی میں بابا! مرا دل بہلے گا کیونکر
سب بیٹیاں ہیں کیا میں نہیں آپ کی دختر؟
بے آپ کے اس گھر میں نہ یا شاہ! رہوں گی
اچھا میں کنیزوں ہی کے ہمراہ رہوں گی"

سب رونے لگے، سن کے یہ بیمار کی تقریر
چلائی سکینہ کہ "میں صدقے مری ہمشیر"
گھبرا کے یہ فرمانے لگے حضرت شبیر
"تم بیٹی کو سمجھاؤ کچھ اے بانوے دلگیر!
کم سن ہے، مسافر مجھے تشویش بڑی ہے
دن چڑھتا ہے، اور آج کی منزل بھی کڑی ہے"

یہ سنتے ہی بس ماں کی تو چھاتی اُمنڈ آئی
چلائی وہ ناشاد کہ "ہے ہے مری جائی"
زینب نے کہا "گھر سے نکلنا ہے یہ بھائی!
مرجانے سے کچھ کم نہیں صغرا کی جدائی
گھر لٹتا ہے، کس طرح قیامت نہ بپا ہو
پہلا ہے یہ غم، آگے خدا جانیے کیا ہو

"آغازِ سفر میں تو یہ ماتم ہے، یہ کہرام
کیا دیکھیں دکھاتا ہے اس آغاز کا انجام
جنگل ہو، کہ بستی ہو، کہاں راحت و آرام
ماں روئے گی بیٹی سے بچھڑ کر سحر و شام
بستی بھی ہے جنگل، جو کلیجا نہ ہو بر میں
بھولے گی وہ، چھوڑیں گے اکیلا جسے گھر میں؟"

صغرا نے کہا "آپ کی باتوں کے میں قرباں   تم جان بچالو، کہ میں لونڈی ہوں تمھی جاں؛
بیٹی ہو علی کی، مری مشکل کرو آساں   جیتی رہی صغرا، تو نہ بھولے گی یہ احساں
کچھ بات بجز گریہ و زاری نہیں کرتیں
امّاں تو سفارش بھی ہماری نہیں کرتیں

"کیا خلق میں لوگو! کوئی ہوتا نہیں بیمار!   ہے کون سی تقصیر کہ سب ہو گئے بیزار
زندہ ہوں، پہ مردے کی طرح ہو گئی دشوار   کیوں بھاگتے ہیں سب، مجھے ہے کون سا آزار؟
حیرت میں ہوں، باعث مجھے کھلتا نہیں اس کا
وہ آنکھ چرا لیتا ہے، منھ تکتی ہوں جس کا

"وہ چاہنے والا ہے، مصیبت میں جو کام آئے   میں سب کی ہوئی اور کوئی میرا نہ ہوا ہائے
اس راہ میں ہمراہ کنیزیں تو ہوں اے وائے!   کہنے کی جو ہو چاہنے والی، وہی رہ جائے
بیماری مزمن میں دوا خوب ہوئی ہے!
تجویز مرے واسطے کیا خوب ہوئی ہے!

"تنہائی میں رونے سے اتر جائے گی یہ تب!   ہاں درد بھی سر میں مرے ہوئے گا نہیں اب!
تڑپوں گی، تو جائے گی یہ اعضا شکنی سب!   بہتر یہی ترکیب ہے، نسخہ یہی انسب!
کم ہو گی حرارت الم و رنج و محن میں!
غم کھانے سے آ جائے گی طاقت مرے تن میں!

"کھوئے گا یبوست کو بھی راتوں کا نہ سونا!   تفریح مجھے بخشے گا منھ اشکوں سے دھونا!
تسکین ہے بالیں پہ عزیزوں کا نہ ہونا!   تنقیۂ کامل ہے مرے واسطے رونا!
راحت سے شب و روز علاقہ نہ مجھے ہو گا!
فاقہ جو کروں گی تو افاقہ مجھے ہو گا!

"تنہائی میں شدّت بھی نہ ہوگی خفقاں کی: بیمار کا دل بہلے گا وحشت سے مکاں کی!
تڑپوں گی نہ فرقت میں امامِ دو جہاں کی! شفقت مجھے یاد آئے گی بہنوں کی نہ ماں کی!
فرقت میں مری طرح جگر کس سے سنبھلتا!
میں گھر میں نہ ہوتی تو یہ گھر کس سے سنبھلتا!

"سب چاہنے والے ہیں، کروں کس کی شکایت! بابا کی یہ تقریر ہے، بہنوں کی یہ صورت!
چھوڑا ہمیں، بس دیکھ لی امّاں کی محبت بولیں نہ پھوپھی جان بھی کچھ، واہ ری قسمت!
فرقت کا الم میرے کلیجے کو چھری ہے
سب اچھے ہیں لوگو! مری تقدیر بُری ہے

"عاشق مرے مشہور ہیں، بھیا کے ہیں واری دُو دن سے خبر بھی نہیں لی آکے ہماری
قاسم کو غرض کیا ہے جو سُنیں گریہ و زاری میں کون، سکینہ ہے چچا جان کو پیاری
اللہ تو ہے گر کوئی غم خوار نہیں ہے
مٹی مری کچھ قبر کو دشوار نہیں ہے

"اُس وقت محبت مری ہو جائے گی حالی جب راہ میں خط پڑھ کے کہیں گے شہِ عالی
لو مر گئی کنبے کی جو تھی چاہنے والی آباد جو حجرہ تھا وہ اب ہو گیا خالی
قسمت نے سُنائی خبرِ مرگ سفر میں
وہ قبر میں سوئی، جسے چھوڑ آئے تھے گھر میں"

یاں ذکر یہ تھا، آئے جو روتے ہوئے اکبر سُرخ آنکھیں تھیں اور زرد تھا غم سے رُخِ انور
چلائی بہن بھائی کی چھاتی سے لپٹ کر "اس سینے کے، ان ہاتھوں کے قربان یہ خواہر
فریاد ہے بے موت بہن مرتی ہے بھائی!
تقدیر ہمیں تم سے جُدا کرتی ہے بھائی!"

ماں بولی "یہ کیا کہتی ہو صغرا! ترے قرباں　　گھبرا کے نہ اب تن سے نکل جائے مری جاں
بس کر مری بچی! ترا اللہ نگہباں،　　صحت ہو تجھے، میری دعا ہے یہی ہر آں
کیا بھائی جدا بہنوں سے ہوتے نہیں؟ بیٹا!
کنبے کے لیے جان کو کھوتے نہیں بیٹا!

"میں صدقے گئی! بس، نہ کرو گریہ و زاری　　صغرا مرا روتا ہے، صدا سن کے تمھاری"
وہ کانپتے ہاتھوں کو اٹھا کر یہ پکاری　　"آ اے مرے ننھے سے مسافر! ترے واری
چھٹتی ہے یہ بیمار بہن، جان گئے تم
اصغر! مری آواز کو پہچان گئے تم

"تم جاتے ہو اور ساتھ بہن جا نہیں سکتی　　تپ ہے، تمھیں چھاتی سے بھی لپٹا نہیں سکتی
جو دل میں ہے، لب پہ وہ سخن لا نہیں سکتی　　دکھ لوں تمھیں، اماں کو بھی سمجھا نہیں سکتی
بے کس ہوں، مرا کوئی مددگار نہیں ہے،
تم ہو، سو تمھیں طاقتِ گفتار نہیں ہے"

مضطر ہوئی سن کر یہ سخن بانوے بے پر　　چادر سے جگر بند کا منھ کر دیا باہر
بیٹی سے کہا دستِ پسر ماتھے پہ رکھ کر　　"لو آخری تسلیم بجا لاتے ہیں اصغر
منھ زرد ہے، رخسار پہ آنسو بھی بہے ہیں
یہ نرگسی آنکھوں سے تمھیں دیکھ رہے ہیں"

تھراتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر وہ پکاری　　"اس ہاتھ کے، اس چاند سے ماتھے کے میں واری
آخر کوئی دن میں ہے بس اب موت ہماری　　بھیّا! نہیں جینے کی میں فرقت میں تمھاری
جب آ کے پھر اس جھولے کو آباد کرو گے
تم بھی مری گودی کو بہت یاد کرو گے"

رونے کا اِدھر غل تھا کہ فضّہ یہ پکاری
"تیار ہے ناموسِ محمّد کی سواری
دروازے کے نزدیک ہے زینب کی عماری
کیا دیر ہے اب، اے اسداللہ کی پیاری!

ہر بار قناتوں کے قریب آتے ہیں عباس
اب جلد سواری ہو، یہ فرماتے ہیں عباس"

شبیر نے رو کر کہا" لو جاتے ہیں صغرا!
جلد آتے ہیں خود، یا تمھیں بلواتے ہیں صغرا!
ہم سب ترے ہی تنہائی کا غم کھاتے ہیں صغرا!
جان اپنی نہ کھونا، تمھیں سمجھاتے ہیں صغرا!

قربان پدر، آب و غذا ترک نہ کیجو
بڑھ جائے گا آزار، دوا ترک نہ کیجو"

بیت الشرفِ خاص سے نکلے شہ ابرار
روتے ہوئے ڈیوڑھی پہ گئے عترتِ اطہار
فراشوں کو عباس پکارے یہ بہ تکرار
"پردے کی قناتوں سے خبردار! خبردار!!

باہر حرم آتے ہیں رسول دوسرا کے
شقہ کوئی جھک جائے نہ جھونکوں سے ہوا کے

"لڑکا بھی جو کوٹھے پہ چڑھا ہو، وہ اُتر جائے
آتا ہو اِدھر جو، وہ اُسی جا پہ ٹھہر جائے
ناقے پہ بھی کوئی نہ برابر سے گزر جائے
دیتے رہو آواز جہاں تک کہ نظر جائے

مریم سے سوا حق نے شرف ان کو دیے ہیں
افلاک پہ آنکھوں کو ملک بند کیے ہیں"

پہنچی جو میں ناقے کے قریں دخترِ حیدر
خود ہاتھ پکڑنے کو بڑھے سبطِ پیمبر
فضّہ تو سنبھالے ہوئے تھی گوشۂ چادر
تھے پردۂ محمل کو اُٹھائے علی اکبر

فرزند کمر بستہ چپ و راس کھڑے تھے
نعلین اُٹھا لینے کو عباس کھڑے تھے

زینت دہ محمل جو ہوئی دخترِ زہرا ناقوں پہ چڑھے سب حرمِ سیّد والا
آنے لگے رہوار، کھلا گرد کا پردا عباس سے بولے یہ شہِ یثرب و بطحا
"صدمہ ہے بچھڑنے کا مرے روح نبی پر
رخصت کو چلو قبر رسول عربی پر"

پیدل شہِ دیں روضۂ احمد کو سدھارے تربت سے صدا آئی کہ "آ آ مرے پیارے"
تعویذ سے شبیر لپٹ کر یہ پکارے "ملتا نہیں آرام نواسے کو تمھارے
حق کے لیے مرنے کا مقام آیا ہے نانا
آج آخری رخصت کو غلام آیا ہے نانا

بزرگوں کے مزاروں سے رخصت

"میں اک تن تنہا ہوں، ستمگار ہزاروں اک جان ہے، اور درپے آزار ہزاروں
اک پھول سے رکھتے ہیں خلش خار ہزاروں اک سر ہے فقط، اور خریدار ہزاروں
واں جمع کئی شہر کے خوں ریز ہوئے ہیں
خنجر مری گردن کے لیے تیز ہوئے ہیں"

کچھ دیر تو رویا کیے شہ سر کو جھکائے پھر واں سے اٹھے فاطمہ کی قبر پہ آئے
پائینِ لحد گر کے بہت اشک بہائے آواز یہ آئی کہ "میں صدقے مرے جائے
ہے شور ترے کوچ کا جس دن سے وطن میں
پیارے میں اسی دن سے تڑپتی ہوں کفن میں"

پہلو میں جو تھی فاطمہ کے تربتِ شبّر اس قبر سے لپٹے بہ محبت شہ صفدر
چلائے کہ "شبیر کی رخصت ہے برادر حضرت کو تو پہلو ہوا اماں کا میسّر
قبریں بھی جدا ہیں تہ افلاک ہماری
دیکھیں ہمیں لے جائے کہاں خاک ہماری"

یہ کہہ کے چلے قبرِ حسن سے شہِ مظلوم   رہوار جو مانگا تو سواری کی ہوئی دھوم
یارانِ وطن گرد تھے افسردہ و مغموم   چلّاتے تھے خادم کہ "چلا خلق کا مخدوم
بس آج سے بے وارث و والی ہے مدینہ
اب پنجتنِ پاک سے خالی ہے مدینہ"

غُل تھا" شہِ ابرار! خدا حافظ و ناصر،   اَے خلق کے سردار! خدا حافظ و ناصر،
رانڈوں کے مددگار! خدا حافظ و ناصر،   محتاجوں کے غم خوار! خدا حافظ و ناصر،
دُکھ فاقوں کے، غربت کے الم کس سے کہیں گے
مشکل کوئی اب ہوگی، تو ہم کس سے کہیں گے"

شہ کہتے تھے" اللہ مددگار ہے سب کا   انسان کی کیا آس، بھروسا ہو تو رب کا
ساماں ہے کبھی غم کا، کبھی عیش و طرب کا   مضطر نہیں فرزند شہنشاہِ عرب کا
مانگو یہ دعا، خیر سے وہ وقت بسر ہو
جس رُوز کہ شبیر کا دُنیا سے سفر ہو"

رُوتے ہوئے وہ لوگ پھرے، شاہ سدھارے   جو صاحبِ قسمت تھے، وہ ہمراہ سدھارے
کس شوق سے مردانِ حق آگاہ سدھارے   عابد طرفِ خانۂ اللہ سدھارے
اُترے نہ مسافر کسی مخلوق کے گھر میں
عاشق کو کشش لے گئی معشوق کے گھر میں

روشن ہوئی کعبے کی زمیں نورِ خدا سے   مکّے نے شرف اور بھی پایا شرفا سے
جھک جھک کے ملے سبطِ پیمبر غربا سے   آباد ہوا شہر نمازوں کی صدا سے
خوش ہو کے ہوا خواہ یہ کہتے تھے علی کے
سب باپ کی خو بُو ہے نواسے میں نبی کے"

کعبے میں بھی اک دن نہ ملا شاہ کو آرام — کوفے سے چلے آتے تھے نامے سحر و شام — کے سے روانگی
اعدا نے گزرنے نہ دیے حج کے بھی ایام — کھولا پسرِ فاطمہ نے باندھ کے احرام
عازم طرفِ راہِ الٰہی ہوئے حضرت
تھی ہشتم ذی الحجہ کہ راہی ہوئے حضرت

کہتے تھے بصد درد کہ "اے کعبۂ داور! — اب تجھ سے جدا ہوتا ہے فرزند پیمبر — کعبے سے رخصت
ملتی نہیں سیّد کو اماں، وائے مقدر! — جاتا ہوں سوئے گور سراسیمہ و مضطر
دوری ہوئی اس گھر سے، بس اب دل کو یقیں ہے
قربانی شبیر کا ہنگام قریں ہے

"اے رکن و مقام! اب ہے مرا کوچ جہاں سے — چھٹتا ہے مکیں خالقِ اکبر کے مکاں سے
اس دشت میں مشتاقِ قضا جاتا ہوں یاں سے — ٹکڑے مجھے ہونا ہے جہاں تیغ و سناں سے
کچھ غم نہیں، دکھ ہو کہ بلا آئے بلا پر
راضی ہوں خداوندِ دو عالم کی رضا پر

"اس راہ میں اب مجھ کو توقف کی نہیں تاب — رخصت ہے مری، اے حجر و منبر و محراب
دل غم سے بھرا آتا ہے، اے زمزم و میزاب — دریا پہ لعیں ذبح کریں گے مجھے بے آب
اک جام دمِ تشنہ دہانی نہ ملے گا
چاہیں گے کنوؤں سے بھی تو پانی نہ ملے گا

"اے کوہِ صفا! دل ہے مکدّر ترے غم سے — صد پارہ ہے سینے میں جگر سنگِ الم سے
افسوس! کہ کچھ ہو نہ سکی سعی بھی ہم سے — قسمت لیے جاتی ہے پہاڑوں میں حرم سے
سب لعل مرے گردِ غریبی سے اٹیں گے
گرمی کے یہ دن بچوں پہ سختی سے کٹیں گے"

پھر قبرِ محمدؐ کی طرف بڑھ کے زیارت — کی عرض "مسافر کی دوبارہ ہے یہ رخصت
کعبے میں بھی مولا نہ میسر ہوئی راحت — آزار پہ باندھے ہیں کمر اہلِ ضلالت
مخفی ہوئے ہیں قافلۂ حاج میں آکے
پائیں تو مجھے ذبح کریں گھر میں خدا کے

"دنیا میں ہیں دو امن کے گھر یا شہِ ابرار! — اک خانۂ حق، ایک درِ احمدِ مختار
بے خوف یہاں آکے جو مخفی ہو گنہ گار — کر سکتا ہے سلطاں نہ وزیر اس کو گرفتار
یہ خانۂ خالق ہے، وہ حضرت کا مکاں ہے
میرے لیے مامن نہ یہاں ہے، نہ وہاں ہے

"ملجا ہے، نہ منجا ہے، نہ مامن، نہ مفر ہے — غربت کا، تباہی کا، مصیبت کا سفر ہے
تلواریں ہیں جلادوں کی اور اک مرا سر ہے — رکھتا ہوں جہاں پاؤں، وہاں خوف و خطر ہے
توڑیں انھیں، گر پھول بھی پائیں مری بو کے
کانٹے بھی ہیں جنگل میں، تو پیاسے ہیں لہو کے

"حاکم نے مدینے کے اُدھر مجھ کو ستایا، — میں سوئے حرم ٹھوکریں کھاتا ہوا آیا
جلّادوں سے یاں بھی کوئی دم چین نہ پایا — میں دھوپ میں ہوں جب سے اٹھا آپ کا سایا
حج بھی نہ میسّر ہوا، مغموم چلا ہوں
احرام تلک باندھ کے محروم چلا ہوں"

یہ کہہ کے روانہ ہوا وہ خاصۂ باری — گویا کہ بیاباں میں چلی بادِ بہاری
جنگل میں کھلا باغ، یہ خوشبو ہوئی ساری — فیاض نے صحرا کی بھی کی کاربر آری
مہکے جو وہ گیسو، تو بیاباں کی بن آئی
نافے لیے جھولی میں نسیمِ ختن آئی

کچھ دن سے اُترتے تھے جہاں سیدِ ابرار
ہو جاتی تھیں تاریک شبیں مطلعِ انوار
اُردو میں وُہ کانیں جو لگاتے تھے دکاں دار
آراستہ ہو جاتا تھا اک چھوٹا سا بازار
نیّت میں فروشندوں کے ثابت قدمی تھی
پانی کا نہ تھا قحط، نہ غلّے کی کمی تھی

قریوں سے زیارت کو جو آجاتی تھی خلقت
کرسی پہ نکل بیٹھتے تھے خیمے سے حضرت
یکساں تھی ہر اک پر نظرِ لطف و عنایت
محتاجوں سے باتیں تھیں غریبوں سے محبت
ہر عاجز و بیکس کی مدد کرتے تھے مولا
درویش کا ہدیہ بھی نہ رد کرتے تھے مولا

اہلِ قریہ کی درخواست

سب عرض یہ کرتے تھے کہ "اے خلق کے والی!
قریوں میں غلاموں کے مکاں بھی تو ہیں خالی
بندوں کو سرافراز کریں سرورِ عالی!
مہماں ہوں غریبوں کے یہ انصار و موالی
فخر اس کا ہے ہر رُخ آپ کا جس دہ کی طرف ہو
عزّت ہو جو مُردوں کی، تو زندوں کا شرف ہو

"سرسبز زراعت بھی ہے جھیلیں بھی ہیں پُر آب
میوے بھی تر و تازہ ہیں گلشن بھی ہیں شاداب
حاضر ہے ہر اک چیز، جو امکاں میں ہے اسباب
باہر ہو کوئی حکم سے مولا کے، یہ کیا تاب!
جیتے ہیں تو حضرت کی غلامی میں مریں گے
ہم جان بھی دے دینے میں صرفہ نہ کریں گے

"گھر چھوڑ کے اب آپ کہاں جاتے ہیں مولا؟
یہ کیا ہے جو اشک آنکھوں میں بھر لاتے ہیں مولا؟
خادم انھیں قدموں سے شرف پاتے ہیں مولا!
سب آپ کا صدقہ ہے جو ہم کھاتے ہیں مولا!
خالی ہو جو دُنیا قدمِ سرورِ دیں سے
دانہ کبھی برسوں میں نہ پیدا ہو زمیں سے

"گھر جتنے ہیں، مولا کے غلاموں کے وہ گھر ہیں
کھینچے کوئی تلوار، تو ہم سینہ سپر ہیں
ہم بندے ہیں، اور آپ محمدؐ کے پسر ہیں
جانیں ہیں تصدق، تو فدا قدموں پہ سر ہیں
اشراف ہیں، صادق ہیں، حیادار ہیں مولا!
اس دِہ کے زن و مرد وفادار ہیں مولا!

"عورات بھی ہیں فاطمہ کے نام پہ قربان
کیا دخترِ زہرا کی زیارت کا ہو ارمان!
فخر اس کا، نبی زادہ ہو جس قوم کا مہمان
فضّہ کو بھی تکلیف نہ ہو، اُن کو ہے یہ دھیان
ہوگا وہی، شہ زادیاں جو منھ سے کہیں گی
سب بی بیاں زینب کی کنیزی میں رہیں گی"

فرماتے تھے حضرت "تمھیں خالق رکھے آباد
دُنیا میں برومند ہو ایک ایک کی اولاد
کیا اپنی تباہی کہوں میں بیکس و ناشاد
رُوؤگے، مفصّل جو سُنوگے مری روداد
درپیش ہے وہ راہ کہ کچھ کہہ نہیں سکتا
بے کنج لحد اب میں کہیں رہ نہیں سکتا

"ہر چند کہ لو چلتی ہے، اُٹھتے ہیں بگولے
اشجار خزاں دیدہ بھی اب تک نہیں پھولے
پڑ جاتا ہے چھالا کوئی آہن کو جو چھولے
تم لوگوں کی ایسی نہیں اُلفت کہ جو بھولے
موت آئی تو بس میں کسی صحرا کے رہیں گے
جیتے جو پھرے ہم، تو یہیں آکے رہیں گے"

اُن سب سے یہ فرما کے چلے سیّدِ ابرار
روتے ہوئے بستی میں گئے اپنی وہ دیں دار
پھر تھا وہی جنگل، وہی صحرا، وہی کہسار
بستی تھی نہ کوسوں، نہ کہیں سایۂ اشجار
گرمی تھی، کہ تھے نخل بھی سوکھے ہوئے بن کے
مُرجھا گئے تھے پھول محمدؐ کے چمن کے

گرمی کی شدت

وہ کوس کڑے اور پہاڑوں کی وہ راہیں! یہ دھوپ میں حدّت تھی کہ جلتی تھیں نگاہیں
دشوار تھا پانی کسی چشمے کا جو چاہیں اُٹھتا تھا دھواں دل سے نکل جاتی تھیں آہیں
سونلا گئے تھے چاند سے منھ سیم بروں کے
ثابت تھا کہ خورشید برابر ہو سروں کے

پھروں پہ جوانانِ علی رُوکے تھے ڈھالیں لُو دیتی تھیں نیزوں کی چمکتی ہوئی بھالیں
گرمی سے وہ کیونکر نہ زبانوں کو نکالیں دھوپ اُن پہ جنھیں سائے میں سیدانیاں پالیں!
اللہ ری تب و تاب بیابانِ بلا کی!
پھولوں کا عرق کھنچتا تھا حدّت سے ہوا کی!

مخفی تھے شرر شدتِ گرما سے حجر میں چلتی تھی یہ لو، آگ بھڑکتی تھی جگر میں
نہ بحر میں راحت تھی کسی دل کو، نہ بر میں جھیلوں میں نہ پانی تھا، نہ پتے تھے شجر میں
پایاب تھے گرمی سے وہ دریا جو بڑے تھے
سوتیں بھی نہ آتی تھیں، کنوئیں خشک پڑے تھے

پتھر کی چٹانوں سے نکلتے تھے شرارے ناری تھی ہوا، سبز شجر زرد تھے سارے
ڈوبے تھے عرق میں اسداللہ کے پیارے دھڑکا تھا، کہ یہ لو کسی بچے کو نہ مارے
ہوش آتا نہ تھا اصغرِ معصوم کو غش سے
اودے تھے لبِ لعل سکینہ کے عطش سے

تھا مہر کی شدّت سے یہ حالِ شہِ ابرار ماتھے سے ٹپکتا تھا عرق، سُرخ تھے رخسار
تمہید میں جنباں تھے لبِ لعل گہربار بھر کر نفسِ سرد یہ فرماتے تھے ہر بار
"اک پھول بھی زہرا کے چمن میں نہ ملے گا
کیا ہوگا جو پانی کسی بن میں نہ ملے گا!"

مشکیں پیے سقّے جو سواری کے تھے ہم راہ — بھر لاتے تھے پانی پئے فوج شہِ ذی جاہ
پانی پہ گرے پڑتے تھے یوں شہ کے ہوا خواہ — جس طرح کہ پیاسوں کا ہو مجمع بہ سرِ چاہ
جنگل میں عطش کا تھا جو صدمہ کرِ دمہ پر
چھڑکتا تھا کوئی، کوئی زرہ پر

بھرتا تھا دمِ سرد پریشاں کوئی ہو کے — دامن سے ہَوا دیتا تھا مُنھ کو کوئی دھو کے
بچتا تھا کوئی لُوں سے ردا چہرے پہ رو کے — رکھ لیتا تھا سر پر کوئی رومال بھگو کے
پڑتی تھیں جو چھینٹیں، تو مزہ دیتا تھا پانی
جھک کر کوئی چُلّو ہی سے پی لیتا تھا پانی

کوفے کی خبریں

غُربت کی جفائیں یوں ہی سہتے ہوئے دن رات — طے راہِ خدا کرتے تھے شبیر خوش اوقات
اک دن جو ہوئی ایک مسافر سے ملاقات — گھوڑے کی عناں روک کے اس سے کہی یہ بات
"ٹھہرا نہیں سکتا، کہ سرِ راہ ہے بھائی!
کوفے کی خبر سے بھی کچھ آگاہ ہے بھائی؟"

اُس نے کہا "کوفے میں عجب غدر ہے مولا! — ہر سمت ہیں فتنے، تو فساد اُٹھتے ہیں ہر جا
دَور اُن کا ہے، کچھ جن کو مروّت نہیں اصلا — ہوتے ہیں ستم، کوئی کسی کی نہیں سُنتا
بے جُرم ستاتے ہیں محبانِ علی کو
غُل ہے کہ چھپائے نہ کوئی گھر میں کسی کو

"اطراف سے فوجیں چلی آتی ہیں برابر — ثابت نہیں ہوتا، کہ چڑھائی ہے یہ کس پر
باغات میں کوفے کے پڑے ہیں کئی لشکر — ناکے سے نکلنے نہیں پاتا کوئی باہر
تیغیں بھی چمکتی ہیں، سنانیں بھی، تبر بھی
رُخ ایک رسالے کا تو دیکھا ہے اِدھر بھی"

حضرت نے کہا "راست یہ سب تیرا بیاں ہے
جو اُن کے دلوں میں ہے، وہ سب مجھ پہ عیاں ہے
اس شہر میں اک ایک مرا دشمن جاں ہے
کچھ غم نہیں، واں جمع اگر فوج گراں ہے
سر اپنا تہِ تیغ میں دھرنے کو چلا ہوں
لڑنے کو تو جاتا نہیں مرنے کو چلا ہوں"

بھر کر نفس سرد بڑھے شاہ فلک جاہ
جلتا تھا جگر، قلب پہ تھا صدمۂ جاں کاہ
مشہور یہ ہے عشر سفر ہوتی ہے کوتاہ
پر کٹتی تھی حضرت پہ عجب رنج سے وہ راہ
منزل پہ بھی کچھ نوش نہ فرماتے تھے شبیر
تشویش تھی ایسی کہ گھُلے جاتے تھے شبیر

دم بھر کہیں دم لے لیا، جب دوپہر آئی
راہی ہوئے پھر، دھوپ جو بالائے سر آئی
لیکن کہیں راحت کی نہ صورت نظر آئی
جب آئی خبر راہ میں، وحشت اثر آئی
مشتاق تھے جس کے، خبر آئی کہ موا وہ
جس دوست کو پوچھا، یہ سُنا قتل ہوا وہ

منزل پہ زبالہ کی جو پہنچے شہِ عالم
خدّام سے ارشاد کیا آپ نے اُس دم
منزل زبالہ
"بچوں کی ہمیں فکر ہے، اپنا نہیں کچھ غم
اس منزلِ پُر ہول میں پانی ہے بہت کم
شربے جو ہیں سیراب انھیں اونٹوں پہ بھر لو
جو مشکیں، پکھالیں ہیں وہ سب پانی سے بھر لو"

یہ سُن کے ہر اک ظرف میں سقوں نے بھرا آب
راہی ہوا اُس بن سے نبی کا گلِ شاداب
گرمی تھی یہ اُس دن، کہ کسی دل کو نہ تھی تاب
تھا شعلہ فشاں دشت میں خورشید جہاں تاب
لو چل رہی تھی، رنگ بھی سنولائے ہوئے تھے
جنگل میں گلِ فاطمہ کمھلائے ہوئے تھے

حر کے رسالے کی آمد

حضرت تو چلے جاتے تھے افسردہ و دل گیر — جو ایک دلاور نے کہی گھوڑے پہ تکبیر
اُس شخص سے فرمانے لگے حضرتِ شبیر — "بتلا سبب اِس ذکر کا اے صاحبِ توقیر!"
کی عرض قریب آپ کے شہ عرش نشیں کے
"وہ نخل نظر آتے ہیں کوفے کی زمیں کے"

لوگوں نے یہ کی عرض کہ "اے دلبرِ زہرا! — خرمے کے یہاں نخل تو دیکھے نہیں اصلا"
عبّاس علم دار نے جب غور سے دیکھا — کی عرض شہِ دیں سے کہ "فوج آتی ہے مولا
کیا جانیے انبوہ ہے، یا چند نفس ہیں
نوکیں یہ سنانوں کی ہیں، یا گوشِ فرس ہیں"

شبیر نے فرمایا کہ "سچ کہتے ہو بھائی — یہ فوج ہمارے لیے کوفے سے ہے آئی
گھر جب سے چھٹا ہے کہیں راحت نہیں پائی — کیا دور ہے گر ہو اِسی جنگل میں لڑائی
سرکش ہیں ارادہ نہ کریں بے ادبی کا
خیمہ کہیں برپا کرو ناموسِ نبی کا"

یہ کہہ کے بڑھے داہنی طرف سبطِ پیمبر — برپا کیا نزدیک جبل خیمۂ اطہر
پہنچے تھے حرم خیموں میں ناقوں سے اُتر کر — جو آ گیا نزدیک ستمگاروں کا لشکر
سر تا قدم آہن میں سیہ کار نہاں تھے
سب ایک ہزار اُن میں زرہ پوش جواں تھے

آنے لگے حضرت کی طرف جب وہ جفاکار — عباس نے فرمایا کہ "بڑھیو نہ خبردار
برپا ہے یہاں خیمۂ شاہنشہِ ابرار — آئینِ ادب سے تمھیں بہرہ نہیں زنہار
جنگل میں وہ اُترا ہے، جو مختارِ زمیں ہے
شیروں کا یہ بیشہ ہے، خبر تم کو نہیں ہے؟"

جنگل میں جو گونجا اسدِ بیشۂ حیدر ۔۔۔ دل ہلنے لگے سینوں میں، سب تھم گئے خود سر
کس پیار سے شبیر پکارے کہ" برادر ! ۔۔۔ پوچھو تو زرا کون ہے سر کردۂ لشکر
آئے ہیں ملاقات کو، یا قصدِ دغا ہے
مجھ پر بھی تو ظاہر ہو کہ منظور کیا ہے"

یہ سُن کے پکارا اسد اللہ کا ضرغام ۔۔۔ "تم لوگوں میں سردار ہے کون اَے سپہ شام !"
خود جوڑ کے ہاتھوں کو یہ بولا وہ خوش انجام ۔۔۔ "سردار ہوں اس فوج کا میں، حُر ہے مرا نام
دعوائے غلامی ہے مجھے آلِ نبی سے
اب عفو ہو، محجوب ہوں اس بے ادبی سے"

آیا بہ ادب پیشِ شہنشاہِ خوش اقبال ۔۔۔ اور عرض یہ کی اُس نے کہ" اَے فاطمہ کے لال! رسالۂ حر کی
ہم لوگ بہت پیاس سے ہیں مضطرب الحال ۔۔۔ بے تاب ہیں سب ماہیِ بے آب کی تمثال پیاس سے بے حالی
آہوں کا دھواں اُٹھتا ہے پیاسوں کے جگر سے
قطرہ نہیں پانی کا ملا تین پہر سے

"کوسوں گئے پانی کے تجسس میں ہوا خواہ ۔۔۔ جز خاک نہ چشمہ کہیں دیکھا، نہ کہیں چاہ
دس سو ہیں سوارانِ عراقی مرے ہمراہ ۔۔۔ بے موت مرے جاتے ہیں سب یا شہِ ذی جاہ!
اب جان نہ گھوڑوں میں، نہ اسواروں میں دم ہے
اَے ساقیِ کوثر کے پسر! وقتِ کرم ہے"

یہ سُنتے ہی بے تاب ہوئے سبطِ پیمبر ۔۔۔ دیکھا رُخِ عباس کو اشک آنکھوں میں بھر کر
فرمایا کہ" یہ لوگ ہیں سب پیاس سے مضطر ۔۔۔ جو ساتھ ہے پانی، ابھی منگواؤ برادر !
بھیّا! کہ اب کھولیو پیاس ان کی بجھا کے
میں کانپ رہا ہوں، کہ یہ بندے ہیں خدا کے"

یہ سنتے ہی سقوں کو علم دار پکارے — "جو پانی ہے، لے آؤ وہ سب پاس ہمارے"
سقے تھے جو سرکار کے، حاضر ہوئے سارے — مشکیزے بھی ناقوں سے بہ تعجیل اُتارے
ہاتھوں میں کٹورے رفقائے شہ کے لیے تھے
سقوں نے پکھالوں کے دہن کھول دیے تھے

دشمن فوج کی سیرابی

مصروف ہوا خود پسرِ ساقیِ کوثر — پیاسوں کو عطا ہونے لگے پانی کے ساغر
تقسیم اِدھر کرتے تھے عباسِ دلاور — پیاسوں کو اُدھر دیتے تھے پانی علی اکبر
ہر لب پہ سخائے شہِ والا کا بیاں تھا
دریائے کرم ساقیِ کوثر کا رواں تھا

چلاتے تھے سقے یہ کٹوروں کو بجا کر — "جو فوج میں پیاسا ہو، وہ پانی پیے آ کر
یخ ہو گیا ہے آب، ہوا دشت کی کھا کر — گرمی میں جگر سرد کرو پیاس بجھا کر
یہ مشک ہر اک چشمۂ شیریں سے بھری ہے
کوثر کا جو مالک ہے سبیل اُس نے دھری ہے"

جان آ گئی جب وقت کبھی تشنہ دہانی — گویا کہ ملا سوکھے ہوئے دھانوں کو پانی
وہ ہاتھ تھے، یا آیۂ رحمت کی نشانی — صحرا میں ہوئی فیض کے دریا کی روانی
تھا شور کہ افراط ہے یاں آبِ بقا کی
جنگل میں ملے خضر، یہ قدرت ہے خدا کی

انساں جو ہٹے، جانوروں کی ہوئی باری — اک چشمۂ حیواں ہوا پھر دشت میں جاری
سرگرم تھا بخشش میں جو وہ خاصۂ باری — برساتا تھا بارانِ کرم ابرِ بہاری
غل تھا کہ عجب رحم ہے زہرا کے پسر میں
پیاسوں کے لیے بحر کو لے آئے ہیں بر میں

جب بادیہ و طاس و لگن ہوتے تھے خالی بھر دیتے تھے پھر سبطِ پیمبر کے موالی
سیراب تھے گھوڑے بھی زہے ہمّت عالی خود پانی پلاتا تھا وہ کونین کا والی
ہر دم کرم حضرتِ باری تھا زمیں پر
اک فیض کا دریا تھا کہ جاری تھا زمیں پر

امام اور حُر کی گفت گو

پیاسا نہ رہا جب کوئی راکب کوئی رہوار تب حُر سے یہ فرمانے لگے سیدِ ابرار
"اب اپنے اِدھر آنے کا احوال کر اظہار کیا قصد ہے؟ کیا عزم ہے؟ اَے مردِ وفادار!
نامہ کوئی حاکم کا جو لایا ہو، تو کہہ دے
لڑنے کے ارادے سے گر آیا ہو تو کہہ دے"

تب حُر نے یہ کی عرض کہ "اے خاصۂ داور! بھیجا ہے مجھے حاکمِ کوفہ نے یہ کہہ کر
رستے میں جہاں تجھ کو ملیں سبطِ پیمبر تو ساتھ سے اُن کے نہ جدا ہو جیو دم بھر
یثرب کو کجا سوئے نجف جانے نہ دینا
کوفے کے سوا اور طرف جانے نہ دینا"

حضرت نے کہا "پھر تجھے کیا اس میں ہے منظور؟" کی عرض کہ "میں حکم سے حاکم کے ہوں مجبور"
بس سُرخ ہوا غیظ سے شہ کا رُخِ پُر نور فرمایا کہ "روکے مجھے، کس کا ہے یہ مقدور
کیا ہوتا ہے دم میں، تو بھلا ٹوک تو ہم کو
لے ہم ابھی جاتے ہیں، ذرا روک تو ہم کو

"پھرتے ہیں یہیں سے، کوئی رُکے تو بھلا راہ اقلیمِ ستمگار سے خود ہی ہمیں اکراہ
کیا اُس سے علاقہ، جو ہے سادات کا بدخواہ جائیں گے، جدھر اب ہمیں لے جائے گا اللہ
کیا شہروں میں کوفے ہی کی آباد زمیں ہے؟
وسعت ہے بہت مُلکِ خدا تنگ نہیں ہے"

یہ کہہ کے فرس کو جو پھرانے لگے سرور — بس ڈال دیا حُر نے بھی ہاتھ اپنا عناں پر
عبّاس بڑھے غیظ میں، تھرّا گئے اکبر — روکا اُنھیں، اور بولے یہ حُر سے شہِ صفدر
"ڈر ہے مجھے اس کا کہ نہ تو قتل کہیں ہو
جا، ماں تری ماتم میں ترے سوگ نشیں ہو"

اندھیری رات کا سفر

خدّام نے اسباب کیا اونٹوں پہ سب بار — راہی اُسی شب کو ہوئے واں سے شہِ ابرار
وہ دشتِ پُر آشوب کی وحشت، وہ شبِ تار — بیہڑ کہیں بن میں، کہیں پتھر، تو کہیں خار
صورت نہ بشر کی نظر آتی تھی بشر کو
معلوم نہ ہوتا تھا کہ جاتے ہیں کدھر کو

جنگل سے جو آتی تھیں درندوں کی صدائیں — دم کرتی تھیں سیدانیاں بچوں پہ دُعائیں
کہتی تھی سکینہ کہ "میں لیتی ہوں بلائیں — کہہ دو مرے بھائی سے کہ صورت تو دکھائیں
عمّو بھی تو آواز سُناتے نہیں مجھ کو
امّاں! کہیں بابا نظر آتے نہیں مجھ کو"

حیران و پریشاں تھا وہ سب لشکرِ شاہی — اسواروں پہ آفت تھی، پیادوں پہ تباہی
ملتی تھی نہ بستی، نظر آتا تھا نہ راہی — گویا شبِ ظلمات تھی جنگل کی سیاہی
گھڑیاں شہِ ذی جاہ پہ یوں راہ میں گزریں
جس طرح کہ یوسف کو شبیں چاہ میں گزریں

سفر کی آخری منزل

سبطِ نبی سے منزلِ مقصد قریب ہے آرام گاہِ جانِ محمدؐ قریب ہے
مولد تو دور رہ گیا، مشہد قریب ہے جس جا لحد بنے گی، وہ سرحد قریب ہے
جاتے ہیں آپ خلق کی مشکل کشائی کو
آئی ہے کربلا سے اجل پیشوائی کو

ہے شورِ آمد آمدِ شاہِ فلک سریر فوجوں کی ہر طرف سے چلی آتی ہے بھیڑ
دعوت کے واسطے ہیں سنانیں لیے شریر حضرت کی پیش کش کو کمانیں ہیں اور تیر
پانی پہ چوکیاں ستم آرا بٹھاتے ہیں
دریا کے گھاٹ برچھیوں سے روکے جاتے ہیں

تیغیں سلاح خانے سے نکلی ہیں بے شمار ہے جا بجا درستیِ اسبابِ کارزار
ہوتے ہیں لیس نیزوں کے دستے کئی ہزار خنجر ہوئے ہیں ذبح کو پیاسوں کے آبدار
نوکیں نکالی جاتی ہیں تیروں کی سان پر
پھل برچھیوں پہ چڑھتے ہیں، پرچم نشان پر

وہ گرمیوں کے دن، وہ پہاڑوں کی راہ سخت پانی نہ منزلوں، نہ کہیں سایۂ درخت
ڈوبے ہوئے پسینے میں ہیں غازیوں کے رخت سونلا گئے ہیں رنگِ جوانانِ نیک بخت
راکب عبائیں چاند سے چہروں پہ ڈالے ہیں
توسنے ہوئے سمند زبانیں نکالے ہیں

وہ دن ہیں، جن دنوں کوئی کرتا نہیں سفر — صحرا کے جانور بھی نہیں چھوڑتے ہیں گھر
رنجِ مسافرت میں ہیں سلطانِ بحر و بر — لب برگِ گل سے خشک ہیں، چہرہ عرق میں تر
آتی ہے خاک اُڑ کے یمین و یسار سے
گیسوئے مشک بار اَٹے ہیں غبار سے

اہلِ حرم ہیں محمل و ہودج میں بے قرار — معصوم پانی مانگتے ہیں رو کے بار بار
بانو پکارتی ہے کہ "یا شاہِ نامدار! — گرمی سے جاں بلب ہے مرا طفلِ شیرخوار
کیونکر یہ دُکھ اُٹھے چھ مہینے کی جان سے
گرمی ہے، یا برستی ہے آگ آسمان سے"

چلّاتی ہے سکینہ کہ "اچھے مرے چچا! — محمل میں گھٹ گئی، مجھے گودی میں لو ذرا
بابا سے کہہ دو اب کریں خیمہ کہیں بپا — ٹھنڈی ہوائیں لے کے چلو، تم پہ میں فدا
سایہ کسی جگہ ہے، نہ چشمہ، نہ چاہ ہے
تم تو ہوا میں ہو، مری حالت تباہ ہے"

سب سالکانِ راہِ ہدایت ہیں شاد شاد — ہے آرزو کہ جلد ملے گوہرِ مراد
بہتے ہیں اشک جوش پہ ہے بحرِ اتحاد — لب پر اُسی کا ذکر ہے، دل میں اُسی کی یاد
معشوق کے سوا کوئی پیشِ نظر نہیں
یہ شوقِ وصل ہے کہ کسی کی خبر نہیں

طے کر چکے حسین جو راہِ صواب کو — مقتل نظر پڑا شہِ گردوں رکاب کو
اُلفت جو واں کی خاک سے تھی اُس جناب کو — اِک عید ہو گئی خلفِ بوتراب کو
دل مثلِ غنچہ واں کی ہوا کھا کے کھِل گیا
رستہ ریاضِ خلد میں جانے کا مِل گیا

جب کربلا میں داخلۂ شاہِ دیں ہوا　　دشتِ بلا نمونۂ خلدِ بریں ہوا
سر جھک گیا فلک کا، یہ اَوجِ زمیں ہوا　　خورشید محوِ حُسنِ حُسینِ حَسیں ہوا
کوسوں ضیا تھی نیّرِ دیں کے ظہور سے
جنگل کو چاند لگ گئے چہرے کے نور سے

ہاتف نے دی صدا کہ زہے شانِ کربلا　　مختارِ کائنات ہیں مہمانِ کربلا
پھولوں سے آج بھر گیا دامانِ کربلا　　بس اب نواں بہشت ہے بستانِ کربلا
خورشیدِ دیں کے فیض سے کیا کیا شرف ملے
روشن ہے جن سے عرش، وہ دُرِّ نجف ملے

خوشبو سے ان گُلوں کی ہوا دشت باغ باغ　　غنچے کِھلے، ہرے ہوئے بلبل کے دل کے داغ
پہنچا سرِ فلک پہ ہر اک کوہ کا دماغ　　دریا نے بھی حبابوں کے روشن کیے چراغ
خورشید بن گئے طبق اس ارضِ پاک کے
تاروں کو گرد کر دیا ذرّوں نے خاک کے

جنگل میں بن گیا شجرِ طور ہر درخت　　بالیدگی سے ہو گئے ٹکڑے گلوں کے رخت
آئی صدا فلک سے، کہ جاگے زمیں کے بخت　　اب اس زمیں پہ سوئے گا مختارِ تاج و تخت
رفعت کا اس کی فرش سے غُل عرش تک گیا
لو آج خاک کا بھی ستارہ چمک گیا

پھیلی جو نکہتِ چمنِ شاہِ بحر و بر　　صحرا میں لہلہا گیا سبزہ بھی سر بسر
جلدی ہوا نے جا کے یہ دریا کو دی خبر　　آیا تری کچھار میں مختارِ خشک و تر
جب تک وہ بحرِ فیض برائے وضو بڑھے
بڑھ کر قدم تو لے کہ تری آبرو بڑھے

ساحل پہ ہوں گے جلوہ نما اب امامِ ہر
دریا دلی کا ہوگا تری شور شہر شہر
یہ سُن کے بے قرار ہوئی علقمہ کی نہر
سر کو قدم کیے ہوئے دوڑی ہر ایک لہر
آمد سُنی جو سبطِ رسالت مآب کی
ساحل سے آنکھ لڑ گئی اک اک حباب کی

بولے فرس کو روک کے شاہِ فلک وقار
"منزل پہ ہم پہنچ گئے" احسانِ کردگار
آگے نہ اب بڑھائے کوئی یاں سے راہوار
یہ وہ زمیں ہے جس کے لیے دل تھا بے قرار
قربان اس مکانِ سعادت نشان کے
پایا دُرِ مُراد بڑی خاک چھان کے

"اُترو مسافرو! کہ سفر ہو چکا تمام
کوچ اب نہ ہوگا، حشر تلک ہے یہیں مقام
مقتل یہی زمیں ہے، یہی مشہدِ امام
اونٹوں سے بار اُتار کے برپا کرو خیام
بستر لگاؤ شوق سے اس ارضِ پاک پر
چھڑکا ہوا ہے آبِ بقا یاں کی خاک پر

"شکرِ خدا کہ رنجِ سفر سے ہوا فراغ
غربت کے اشتیاق میں بھولا وطن کا داغ
خاطر شگفتہ ہو گئی، اب دل ہے باغ باغ
طبقہ یہ حشر تک نہیں ہونے کا بے چراغ
آگے کہیں نہ جائیں گے اس ارضِ پاک سے
اُلفت ہماری خاک کو ہے یاں کی خاک سے"

میدانِ کربلا حضرتِ زینب کی نظر میں

زینب نے جب یہ سرورِ دیں سے سُنا کلام
محمل سے یوں پکاری کلیجے کو تھام تھام
کیوں چلتے چلتے آپ نے یاں روک لی لگام
بھیّا! اِدھر تو آؤ، یہ ہے کون سا مقام
بستی بھی ہے کوئی، کہ یہی ایک نہر ہے
اس دشتِ پُرخطر میں اُترنا تو قہر ہے

"جنگل میں ہو بشر کے لیے سو طرح کا ڈر
اُٹھتے ہیں بار بار بگولے اِدھر اُدھر
دن کٹ گیا، تو ہوئے گی شب کس طرح بسر
لشکر میں غل رہے گا درندوں کا رات بھر
بچّے بھی مارے ہول کے تر ہیں پسینے میں
میرا تو دل ابھی سے اُچھلتا ہے سینے میں

"اس سرزمیں کے گُل نظر آتے ہیں مجھ کو خار
نشتر سے کم نہیں رگِ جاں کو یہ سبزہ زار
یہ باد تند تیر سی ہوتی ہے دل کے پار
اس بن کی خاک سے مری خاطر یہ ہے غبار
کیا رنگ آگے دیکھیے قسمت دکھاتی ہے
یاں کی زمیں سے خون کی بو مجھ کو آتی ہے

"لوگو مجھے بتاؤ یہ دریا ہے، یا سراب
کاسے سروں کے ہیں، کہ یہ ہیں ساغرِ حباب
موجوں کو دیکھ دیکھ کے ہے دل کو پیچ و تاب
ڈوبا ہے کون، شور ہے کیسا میانِ آب
دھاریں لہو کی مل گئیں دریا کی موج میں
لہریں یہ ہیں، کہ چلتی ہیں تلواریں فوج میں

"غش کھا کے اب میں گرتی ہوں مجھ میں نہیں حواس
عبّاس کو بلاؤ، کہ آئیں بہن کے پاس
صغرا بلک رہا ہے، سکینہ کو ہے ہراس
خیمے یہاں ہوئے، تو ہوئی زندگی سے یاس
نقشہ وہ پھر گیا مری چشمِ پُر آب میں
ایسا ہی دشت تھا جسے دیکھا تھا خواب میں"

آنکھوں میں اشک بھر کے یہ بولے شہِ زمن
"دُتر رہیں، کہ خوف کی جا کچھ نہیں بہن
یہ نہرِ علقمہ ہے، یہ ہے کربلا کا بن
آئے اسی کے شوق میں ہم چھوڑ کر وطن
رہنے میں اس جگہ کے ضرر کیا فقیر کا
خیمہ یہاں ہوا تھا جنابِ امیر کا

"سجدے کریں گے جس پہ ملک، وہ زمیں یہ ہے | جس پر کھُدا ہے نقشِ شفا، وہ نگیں یہ ہے
بطحا یہ ہے، مدینۂ اربابِ دیں یہ ہے | کعبہ یہ ہے، نجف یہ ہے، خلدِ بریں یہ ہے
تھی اس زمیں کی قدر رسولانِ پاک کو
آنکھوں سے سب لگا گئے ہیں یاں کی خاک کو"

اُترا یہ کہہ کے کشتیِ اُمّت کا ناخدا | جتنے سوار تھے، وہ ہوئے سب پیادہ پا
حضرت نے مسکرا کے یہ ایک ایک سے کہا | "دیکھو تو کیا ترائی ہے، کیا نہر، کیا فضا"
اکبر شگفتہ ہو گئے صحرا کو دیکھ کر
عبّاس جھومنے لگے دریا کو دیکھ کر

بولے یہ اشک بھر کے شہنشاہِ سربلند | "کیوں، یہ مقام ہے تمھیں شاید بہت پسند"
کی مسکرا کے عرض کہ "یا شاہِ ارجمند! | کچھ یاں تو خود بخود ہوئی جاتی ہے آنکھ بند
شیر اب یہیں رہیں گے عنایت جو رب کی ہے
میں کیا کہوں، حضور! ترائی غضب کی ہے"

باچشمِ نم وہاں سے بڑھے آپ چند گام | گویا زمیں کی سیر کو اُترا مہِ تمام
مثلِ نجوم گرد تھے حیدر کے لالہ فام | شکلیں وہ نور کی، وہ تجمل، وہ احتشام
زلفیں ہوا سے ہلتی تھیں، ہاتھوں میں ہاتھ تھے
لڑکے بھی بند کھولے ہوئے ساتھ ساتھ تھے

تکنے لگے پہاڑوں کو مسلم کے دونوں لال | پھولوں سے کھیلنے لگے زینب کے نونہال
سبزے سے واں کے ابنِ حسن خوش ہوئے کمال | کی عرض "اس زمیں کا ہر اک گُل ہے بے مثال
اے خسروِ زمن! یہ جگہ ہے جلوس کی
خوشبو ہے یاں کی خاک میں عطرِ عروس کی"

صحرا سے آئے پھر سوئے دریا شہِ اُمم — الیاس شاد ہو کے پکارے زہے کرم
اُبھریں درود پڑھتی ہوئی مچھلیاں بہم — بولے حباب آنکھوں پہ شاہا ترے قدم
پانی میں روشنی ہوئی حُسنِ حضور سے
لے لیں بلائیں پنجۂ مرجاں نے دور سے

ٹھہرے کنارِ نہر جوانانِ ماہ رو — دھویا کسی نے رُخ، کسی نے کیا وضو
گھوڑے جو آئے پیاس بجھانے کنارِ جو — بھر لائے اشک آنکھوں میں شبیرِ نیک خو
کھینچی اک آہ سرد ترائی کو دیکھ کر
ہاتھوں سے دل پکڑ لیا بھائی کو دیکھ کر

خیمے لگانے کا اہتمام

بولے یہ ہاتھ جوڑ کے عباس نام ور — "خیمے کہاں بپا کریں یا شاہِ بحر و بر!
ایذا ہو تھلوں میں بہت اہلِ بیت پر — بچّے ہیں نازکی میں گلوں سے زیادہ تر
کب سے عماریوں کے ہیں پردے چُھٹے ہوئے
گرمی کے مارے دم ہیں سبھوں کے گھٹے ہوئے"

کچھ سوچ کر امامِ دو عالم نے یہ کہا — "زینب جہاں کہیں، وہیں خیمے کرو بپا"
پیچھے ہٹے یہ سُنتے ہی عباسِ باوفا — جا کر قریبِ محملِ زینب یہ دی صدا
"حاضر ہے جاں نثار امامِ غیور کا
برپا کہاں ہو خیمۂ اقدس حضور کا"

بولی یہ سُن کے دخترِ خاتونِ روزگار — "اس امر میں بھلا مجھے کیا دخل، میں نثار
خشکی ہو یا ترائی، چمن ہو کہ سبزہ زار — ہر جا مسافروں کا نگہباں ہے کردگار
مختارِ کائنات کے تم نورِ عین ہو
اُترو وہیں جہاں مرے بھائی کو چین ہو

"آرام کو ترس گئے جب سے چھُٹا ہی گھر
کن آفتوں میں پانچ مہینے ہوئے بسر
یہ آندھیاں، یہ گرمی کے ایّام، یہ سفر
دن بھر چلے ہیں دھوپ میں، جاگے ہیں رات بھر

گرمی سے کھیت خشک تھے جنگل اُجاڑ تھا
ایک ایک کوس راہ جبل میں پہاڑ تھا

"آج اُس زمین پر ہمیں لایا ہی آسماں
اب دیکھیے دکھاتی ہی تقدیر کیا یہاں
آقا کی خیریت کی دُعا مانگو بھائی جان!
یارب مسافروں کو مُبارک ہو یہ مکاں

دشمن بہت ہیں بادشہ خوش خصال کے
بھیّا! بہن نثار، زرا دیکھ بھال کے

"بھائی سے اس زمیں کی سُنی ہی بہت صفت
ہیں وہ امام، واقفِ اسرارِ شش جہت
جو جو سخن ہیں، اُن سے بھی لازم ہی مشورت
صدقے گئی جیب سے بھی کرلو مصلحت

ساحل پہ دشمنوں میں کسی کا عمل نہ ہو
بھیّا مجھے یہ ڈر ہے کہ ردّ و بدل نہ ہو"

دستِ ادب کو جوڑ کے اس شیر نے کہا
"تشویش کچھ نہ کیجیے، اے بنتِ مرتضا!
ہر چند مصلحت مری کیا اور عقل کیا
لیکن کوئی ترائی سے بہتر نہیں ہی جا

جو مہر فاطمہ میں ہی، یہ فرات ہی
گرمی میں قرب نہر کا آبِ حیات ہی"

یہ کہہ کے خادموں کو پکارا وہ مہ جبیں
"فرّاش جلد آکے مصفا کریں زمیں
حاضر ہوں آب پاش، محل دیر کا نہیں
یاں ہوگا خیمۂ حرم بادشاہ دیں

جلد اُن کو بھیجو لوگ ہیں جو کاروبار کے
لے آؤ اُشتروں سے قناتیں اُتار کے"

بولے زہیر قین کہ "حاضر ہیں سب غلام"　　بڑھ کر ہوئے حبیب بھی مصروفِ اہتمام
کرسی منگا کے بیٹھ گئے اک طرف امام　　رُتبے میں ہوگئی وہ زمیں عرش احتشام
پرتو فگن تھا نورِ رسالت مآب کا
سر پر لگا تھا چترِ زری آفتاب کا

شامی لشکر کی آمد

تھا لشکر میں خموش دو عالم کا تاج دار　　کھلوا رہے تھے خیموں کو عباسِ ذی وقار
ناگہ اُٹھا شمال کی جانب سے اک غبار　　رایت سیاہ و سُرخ نظر آئے تین چار
مڑ کر کہا حبیب نے "کچھ رنگ اور ہے"
بولا کوئی "یہ شام کے لشکر کا طور ہے"

یک جا ہوئے یہ سن کے جوانانِ صف شکن　　نکلا ہر اک ولی کی زباں سے یہی سخن
"آئے ہیں ملکِ غیر میں ہم چھوڑ کر وطن　　تو سب کی خیر کیجیو اے ربِّ ذو المنن!
اعدائے دیں کے شر سے حفاظت میں ہم رہیں
ناحق کوئی لڑے بھی تو ثابت قدم رہیں"

کہنے لگے پکار کے عباسِ حق شناس　　"ہاں! ناصرانِ قبلۂ کونین با حواس
دل میں نہ خوف ہو، نہ زباں پر کلامِ یاس　　جیتے ہو، تو حسین سے ہو قدرداں کے پاس
گر مر گئے، تو روضۂ رضواں کی سیر ہے
دونوں طرح مآل تمہارا بخیر ہے"

یہ ذکر تھا کہ بن میں سیاہی سی چھا گئی　　ڈنکے کی دشت ظلم سے کوسوں صدا گئی
گھوڑوں کے دوڑنے سے زمیں تھرتھرا گئی　　جنگی سیاہ گھاٹ کے نزدیک آ گئی
ایک ایک پیل زور و تہمتن شکوہ تھا
ابنِ رکابِ سبز قدم سرگروہ تھا

بولے ملازموں سے یہ عباسِ با وفا　　"دریافت تو کرو کہ ارادہ ہے ان کا کیا
آتے ہی سرکشی، یہ طریقہ ہے کون سا؟　　کہہ دو کہ اہلِ بیت کے خیمے کی ہے یہ جا
لازم رسول زادیوں کا احترام ہے
اُتریں الگ کہیں یہ ادب کا مقام ہے

"کرسی نشیں ہے تختِ دلِ سید البشر　　آئینِ خسروی سے یہ واقف نہیں مگر
آتی ہے اُڑ کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے گرد اِدھر　　کیا ہے جو روکتے نہیں باگیں یہ خیرہ سر
بھولے ہوئے ہیں اس پہ کہ ہم خاکسار ہیں
شاید ہوا کے گھوڑوں پہ ظالم سوار ہیں"

لبِ دریا خیمے نصب کرنے کی ممانعت

اُس فوج کے رئیس نے بڑھ کر کیا کلام　　"حکمِ امیر ہے یہیں اترے گی فوجِ شام
یہ چھوڑیں گے ہم اسے کہ جو راحت کا ہے مقام؟　　دریا سے آپ ہٹ کے بپا کیجیے خیام
لشکر کشی ہے بادشہِ کائنات پر
کل مورچے سپاہ کے ہوں گے فرات پر

"کوفے سے کُل جواں اِدھر آئے ہیں دس ہزار　　رستے میں شام کی ابھی فوجیں ہیں بے شمار
خالی ہیں منزلیں، نہ بیاباں، نہ کوہسار　　شہروں سے، پرگنوں سے، چلے آتے ہیں سوار
لاکھوں ہیں، کوئی قبل کوئی بعد آئے گا
گیتی ہلے گی جب پسرِ سعد آئے گا

"فوجوں کا جائزہ تھا وہاں، ہم چلے تھے جب　　گردے میں بیس کوس کے لشکر پڑا تھا سب
دستوں کی روم و شام کے آمد ہے روز و شب　　اس ارض پر جو ہو نہ سمائی تو کیا عجب
کیسے مقام گر کوئی گوشہ جدا ملے
ممکن نہیں کہ نہر پہ خیمے کی جا ملے

"ہم گھاٹ روکنے کے لیے آئے ہیں اِدھر   ہے آج شب کو داخلۂ شمر کی خبر"
سُنتے ہی یہ ترائی میں گونجا وہ شیرِ نر   تیوری چڑھا کے تیغ کے قبضے پہ کی نظر
کم تھا نہ ہمہمہ اسدِ کردگار سے
نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے

غصّے میں رکھ کے دوش پہ شمشیرِ برق دم   نعرہ کیا اسد نے کہ "تم سے ہٹیں گے ہم؟
گر فوجِ قاہرہ کی ہے آمد، تو کیا ہے غم   گرتا ہے کٹ کے سر وہیں جس جا جمے قدم
بھریں جو شیر، سامنے آتا نہیں کوئی
یہ آنکھ وہ ہے جس میں سماتا نہیں کوئی

"دُنیا ہو اک طرف تو نہ آئے خیال میں   لاکھوں پہ اپنی تیغ چلی ہے جدال میں
کیا کیا جری ہیں فاتحِ خیبر کی آل میں   گیتی ہو بے نشاں، اگر آئیں جلال میں
حملہ کریں چڑھا کے اگر آستین کو
ہم آسماں سمیت اُلٹ دیں زمین کو

"دیکھیں ہٹا تو دو، نہیں ہٹنے کے یاں سے ہم   برپا کریں گے اَب تو یہیں خیمۂ حرم
گر واں بہت ہے فوج، تو ہم بھی نہیں ہیں کم   آلِ نبی بڑھا کے ہٹاتے نہیں قدم
ہم اور خوفِ جاں سے لڑائی کو چھوڑ دیں؟
دیکھا نہیں کہ شیر ترائی کو چھوڑ دیں

"گو فوج کم امامِ دلاور کے ساتھ ہے   روحِ رسول نائبِ حیدر کے ساتھ ہے
عباس سا غلام برادر کے ساتھ ہے   لاکھوں تو لے سکیں، یہ زمیں سر کے ساتھ ہے
غصّے کے وقت جاں کو نہیں جاں سمجھتے ہیں
ہم ایک اور لاکھ کو یکساں سمجھتے ہیں

"یاں سے کہیں رسول کا پیارا نہ جائے گا — ہم وہ نہیں کہ جان کو وارا نہ جائے گا
لاشہ بھی اُٹھ کے یاں سے ہمارا نہ جائے گا — مر کر بھی ہاتھ سے یہ کنارا نہ جائے گا
رکھتے ہیں اس زمیں کے لیے سر کو ہات پر
قبضہ ہے تا بہ حشر ہمارا فرات پر"

اعدا پکارے تب، کہ" نہ مانیں گے ہم یہ بات — اُترے گی آج فوج ہماری لبِ فرات"
بولا یہ سُن کے بازوے سلطانِ کائنات — "ہٹ جاؤ میرا ہاتھ ہے دستِ خدا کا ہات
کیا تم کو ضربِ تیغِ علی کی خبر نہیں
آگے بڑھا قدم تو کسی تن پہ سر نہیں

"تم کون ہو؟ حسین ہیں مختارِ خشک و تر — اُن کے سوا ہے کون شہنشاہِ بحر و بر؟
دیکھو فساد ہوگا، بڑھو گے اگر اِدھر — شیروں کا یاں عمل ہے، تمھیں کیا نہیں خبر؟
سبقت کسی پہ ہم نہیں کرتے لڑائی میں
بس کہہ دیا کہ پاؤں نہ رکھنا ترائی میں

"ہر چند خاکسار ہیں فرزندِ بوتراب — پر سرکشی کی ہم سے کسی کو نہیں ہے تاب
کہنی تک آستیں کو جو اُلٹیں دمِ عتاب — گردوں میں تھرتھرا کے چھپے قرصِ آفتاب
آجائے انقلاب کی آفت جہان پر
ہو آسماں زمیں پہ، زمیں آسمان پر

"ارض و سما کو ہم تہ و بالا کریں ابھی — جو سرکشی کرے، اُسے پسپا کریں ابھی
اِس سرزمیں کو خون کا دریا کریں ابھی — ساحل تک آئے جو اُسے ٹھنڈا کریں ابھی
بولے کوئی تو تن سے سر اُس کا جدا کریں
خیمہ بپا نہ ہو، تو قیامت بپا کریں"

ظالم بگڑ بگڑ کے بڑھے ایک بار سب　　بلوہ جو ہو گیا، سمٹ آئے سوار سب
نیزے علم لیے ہوئے تھے نیزہ دار سب　　باندھے تھے ایک غول ضلالت شعار سب
لیکن ملا نہ سکتے تھے آنکھ اُس دلیر سے
اک شور تھا، کہ چھین لو دریا کو شیر سے

بگڑے ابو ثمامہ و سعدِ فلک سریر　　بولے اسد، کہ زجر کے قابل ہیں یہ شریر
جوڑا کماں میں ابنِ مظاہر نے بڑھ کے تیر　　تولی زہیر قین نے شمشیرِ بے نظیر
عباس کو غیظ لشکرِ بد خو پہ آ گیا
غصے سے بَل ہلال کے اَبرو پہ آ گیا

اُلٹی جناب قاسمِ ذی شاں نے آستیں　　قبضے پہ ہاتھ رکھ کے بڑھے اکبرِ حسیں
بولے بگڑ کے بچے زینب کے مہ جبیں　　"شیروں سے کیا ترائی کو لیں گے یہ اہلِ کیں
کہیے تو نیزہ بازوں کو ہم دیکھ بھال لیں
تیوری کوئی چڑھائے تو آنکھیں نکال لیں"

آگے تھے سب کے حضرتِ عباسِ ذی حشم　　بڑھ بڑھ کے روکتے تھے دلیروں کو دم بہ دم
تیغیں جو تولتے تھے اُدھر بانیِ ستم　　کہتے تھے "سر نہ ہوگا، بڑھایا اگر قدم"
لرزہ تھا رُعبِ حق سے ہر اک نابکار کو
روکے تھا ایک شیرِ جری دس ہزار کو

بڑھتا تھا جھومتا ہوا جس دم وہ شیرِ نر　　گرتا تھا ڈر کے کوئی اِدھر اور کوئی اُدھر
تیغیں جو کھنچ گئیں، تو ہوا اور شور و شر　　گھبرائے اہلِ بیتِ شہنشاہِ بحر و بر
آغوش میں پھپھی کے سکینہ دہل گئی
غُل پڑ گیا کہ نہر پہ تلوار چل گئی

محمل سے منہ نکال کے فضّہ نے یہ کہا   "بلوہ کنارِ نہر ہے اے بنتِ مرتضیٰ
نیزے بڑھا بڑھا کے ہٹاتے ہیں اشقیا   قبضے پہ ہاتھ رکھے ہیں عباسِ باوفا
کیا جانے کس نے ٹوک دیا ہے دلیر کو
سب دشت گونجتا ہے یہ غصہ ہے شیر کو"

امام کا بھائی کو سمجھانا

خیمے میں مضطرب تھی اِدھر خواہرِ امام   عبّاس اُدھر غضب میں بڑھے سوئے فوجِ شام
کُرسی سے جلد اُٹھ کے پکارے شہِ انام   "بھیّا! ہمارے سر کی قسم روک لو حسام
یکساں ہے بر و بحر ہماری نگاہ میں
غیظ و غضب کو دخل نہ دو حق کی راہ میں

"ہے گرچہ ان کی بے ادبی قابلِ سزا   پر تم پسر رحیم کے ہو بخش دو خطا
جنگل ہو، یا ترائی ہو، ہے ہر جگہ خدا   مظلوم کو، غریب کو غصّے سے کام کیا
کرتا ہے عاجزی وہی جو حق شناس ہے
ہم کو نبی کی رُوحِ مطہر کا پاس ہے

"صدقے ترے جلال کے اے میرے آفتاب!   یاد آگیا مجھے اسداللہ کا عتاب
تم سے مقابلے کی جہاں میں کسے ہے تاب   جعفر ہو دبدبے میں، شجاعت میں بوتراب
یہ کیا ہیں، تم تو سدِّ سکندر کو توڑ دو
لو ہم کو چاہتے ہو، تو دریا کو چھوڑ دو

"او تمھیں قسم ہے جنابِ امیر کی   بگڑو نہ سرکشی پہ سپاہِ شریر کی
ہمراہ بیٹیاں ہیں شہِ قلعہ گیر کی   سب سے جدا ہی چاہیے منزل فقیر کی
کیا دشت کم ہے صابر و شاکر کے واسطے
یہ اہتمام ایک مسافر کے واسطے!

"تھوڑے سے بستروں کی ہے درکار ہم کو جا — جنگل ہوا تو کیا، جو ترائی ہوئی تو کیا
ہے عمر بے ثبات، زمانہ ہے بے وفا — آرام کا محل نہیں یہ عاریت سرا
وہ اب کہاں ہیں، شہر جنھوں نے بسائے ہیں
سب اس زمیں پہ خاک میں ملنے کو آئے ہیں"

آقا نے دی جو اپنے سر پاک کی قسم — بس تھرتھرا کے رہ گیا وہ صاحب کرم
پر تھی شکن جبیں پہ، نہ ہوتا تھا غیظ کم — چپ ہو رہے، قریب جب آئے شہ اُمم
گردن جھکا دی، تا نہ ادب میں خلل پڑے
قطرے لہو کے آنکھوں سے لیکن نکل پڑے

گردن میں ہاتھ ڈال کے حضرت نے یہ کہا — "کیوں کانپتے ہو غیظ سے بھائی، یہ کیا یہ کیا
اب رکھ بھی دو یہ تیغ و سپر، تم پہ میں فدا — دریا کو تم تو لے چکے، اے میرے مہ لقا
وہ شیر ہو، کہ دھاک ہے ساری خدائی میں
دیکھو کوئی تمھارے سوا ہے ترائی میں؟"

بولا جھکا کے قدموں پہ سر وہ اسیرِ غم — "حکم خدا ہے حکم امام ملک حشم"
ریتی پہ لا کے گاڑ دیا شیر نے علم — برپا ہوئے خیام شہ آسماں حشم
ذرّے نجوم بن گئے سارے زمین پر
اُترے خدا کے عرش کے تارے زمین پر

کھینچا فلک پہ خیمۂ زنگار گوں نے سر — روشن ہوئے کلس کی تجلی سے دشت و در
تارِ شعاع تھے، کہ طنابیں تھیں جلوہ گر — پردہ حرم کا تھا، کہ قناتیں اِدھر اُدھر
جنگل کا اوج ہو گیا خیمے کی شان سے
پلّہ زمیں کا اُٹھ کے ملا آسمان سے

تھا اُس کے ارتفاع میں کرسی کا سب جو طور   شُکّانِ عرش دیکھتے تھے فرش کو بہ غور
شمسے کا اوج اوج تھا، خیمے کا دَور دَور   گویا کہ آسماں کے تلے آسماں تھا اور
سر جا ملا جو شمسۂ کیواں جناب کا
سونا اُتر گیا ورقِ آفتاب کا

یزیدی فوجوں کی آمد
خیمے میں اُترے یاں تو شہِ عرش بارگاہ   آ آ کے اُس طرف بھی اُترنے لگی سپاہ
کوسوں علم کھُلے تھے، جدھر کیجیے نگاہ   یاں تک کہ بند ہو گئی چاروں طرف سے راہ
فوجوں سے تا بہ صبح زمیں رن کی بھر گئی
اِک رات میں چڑھی ہوئی ندی اُتر گئی

عمر ابن سعد کی آمد
اِس کثرتِ سپاہ پہ ناگہ ہوئی یہ دھوم   "آ پہنچا شام سے پسرِ سعدِ نحس و شوم
جس کے جلو میں لاکھ سواروں کا ہے ہجوم   اکثر ہیں یکہ تاز جوانانِ شام و روم
بس کھل گیا نہ طور صفائی کا ہوئے گا
اب کل سے بند و بست لڑائی کا ہوئے گا"

یہ ذکر تھا کہ دور سے ظاہر ہوئے نشاں   اُمڈا زمیں پہ ظلم کا دریائے بے کراں
موجوں کی طرح سب تھیں صفیں پیش و پس رواں   لہراتے تھے ہَوا سے علم مثلِ بادباں
ہلتا تھا دشت کیں دُہل اس طرح بجتے تھے
باجوں کا تھا یہ شور کہ بادل گرجتے تھے

جنگی وہ رومیوں کے پرے، شامیوں کے دل   خوفِ خدا نہ جن کو نہ اندیشۂ اجل
مکار و اہلِ نار و دغا باز و پُر دَغل   شکلیں مہیب، دیو سے قد، ابرؤوں پہ بل
بد خواہِ خاندانِ رسالت پناہ تھے
ایسے جلے ہوئے تھے کہ چہرے سیاہ تھے

تلواریں کھینچے بڑھ کے بڑھے دو طرف سوار — غل ہو گیا سلامی کے باجوں کا ایک بار
ڈنکے کی دم بہ دم تھی صدا آسماں کے پار — "آگے بڑھے چلو" یہ نقیبوں کی تھی پکار
گھوڑوں پہ گرد و پیش رئیسانِ شام تھے
زرّیں کمر جلو میں کئی سو غلام تھے

اُترا قریبِ خیمہ فرس سے وہ خیرہ سر — سر پر لگا یا دوڑ کے خادم نے چترِ زر
پہلے تو اپنی فوج پہ ظالم نے کی نظر — بولا وہ پھر کسی سے تو سوئے نہر دیکھ کر
"خیمہ ہے کس طرف کو شہِ خوش خصال کا
دریا پہ تو عمل نہیں زہرا کے لال کا"

خولی نے تب کہا کہ "ہماری طرف ہے نہر — آئے تھے یاں اُترنے کی خاطر امامِ دہر
فرماتے تھے، یہ نہر تو ہے میری ماں کا مہر — ہم نے اُٹھا دیا اُنھیں لیکن بہ جبر و قہر
عبّاس مستعد تھے سبھوں سے لڑائی کو
شبیر پھیر لے گئے سمجھا کے بھائی کو

"وہ دھوپ میں ہے خیمہ زنگاری حسین — راحت نہ رات کو ہے کوئی دم نہ دن کو چین
بھردن علی کی بیٹیاں روتی ہیں کر کے بین — آفت میں مبتلا ہے محمّد کا نورِ عین
بچوں کی مارے پیاس کے حالت عجیب ہے
خیمہ نہ سائے میں ہے، نہ دریا قریب ہے"

بولا شقی کہ "کتنی ہے فوجِ شہِ اُمم — سُنتے تھے واں سپاہِ حسینی کی دھوم ہم"
اُس نے کہا "حسین کے یار بہت ہیں کم — فاقوں کے مارے فوج میں کسی کے نہیں ہے دم
ایسی نہ فوج کچھ ہے، نہ ایسے نشان ہیں
میں نے تو خود گنا ہے بہتّر جوان ہیں

"یہ سب غلط سُنا تھا کہ ہے لشکر کثیر — کچھ نوجواں ہیں، طفل ہیں کچھ، اور کچھ ہیں پیر
ہیں اُن میں سات آٹھ تو بچے بہت صغیر — پس جائیں گے وہ ٹاپوں سے ہنگامِ دار و گیر
کیا چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی طاقت دکھائیں گے
اُن سے تو نیچے بھی سنبھالے نہ جائیں گے"

بولا وہ تب کہ "ہو گئے جواں یاں کئی ہزار" — خولی نے کی یہ عرض کہ "ممکن نہیں شمار
ہیں تین چار کوس کے گردے میں سب سوار — ایک اک جواں ہے رستمِ میدانِ کارزار
کیا کوئی لڑ سکے گا، قیامت کی فوج ہے
لشکر کی ہیں صفیں، کہ سمندر کی موج ہے

"پیدل ہیں اک طرف، تو رسالے ہیں اک طرف — خنجر ہیں ایک سمت، تو بھالے ہیں اک طرف
جاں باز ہاتھ قبضوں پہ ڈالے ہیں اک طرف — اور دس ہزار برچھیوں والے ہیں اک طرف
سب لوگ فکرِ قتلِ شہنشاہِ دیں میں ہیں
کھینچے ہوئے کمانوں کو سرکش کمیں میں ہیں

"ہاتھوں میں پہلوانوں کے ہیں گرزِ گاؤ سر — ضربت سے جن کی ٹوٹتی ہے کوہ کی کمر
ہر جا بچھی ہوئی ہیں کمندیں اِدھر اُدھر — کالی گھٹا سی چھائی ہے ڈھالوں کی نہر پر
سب لوگ جا بجا پئے قتل و ستیز ہیں
تیغیں بھی ہیں ڈبی ہوئی، خنجر بھی تیز ہیں"

بولا خبر یہ سُن کے وہ بانیِ ظلم و جور — "کل تک ابھی تو شام سے آئے گی فوج اور
حاکم ہیں آج زیرِ فلک ہم، ہمارا دور — سر کاٹ لیں گے، صلح کا ہوگا اگر نہ طور
فرصت اب ایک دم کی نہ ہاں دو حسین کو
بیعت اگر کریں تو اماں دو حسین کو"

بولا کوئی کہ "ہے انھیں بیعت سے اجتناب
مرنے کو راہِ حق میں سمجھتے ہیں وہ ثواب"
کہنے لگا وہ تیرہ دروں کھا کے پیچ و تاب
"ہاں اب خیامِ شہ میں پہنچنے نہ پائے آب
پیاسوں پہ تیریاں سے بھی پڑتے ہیں کس طرح
دیکھیں حسین لاکھوں سے لڑتے ہیں کس طرح"

آمد اسی طرح رہی لشکر کی روز و شب
نرغے میں آ گیا پسرِ سیّد العرب
گرمی میں ساتویں سے ہوئی شدّتِ تعب
پانی مسافروں پہ ہوا بند ہے غضب
مرجھا گیا چمن شہِ گردوں جناب کا
شور آٹھویں سے ہونے لگا آب آب کا

غش تھے تمام کو پیاس سے اطفالِ ماہ جبیں
جز آبِ اشک پانی کا قطرہ نہ تھا کہیں
تھا دودھ خشک بیٹھی تھی بانوئے حزیں
دم توڑتا تھا جھولے میں اصغر سا نازنیں
خندق میں گرد خیمے کے آتش بھڑکتی تھی
باقر تڑپ رہا تھا، سکینہ بلکتی تھی

شبِ عاشورا

ہولناک رات

جب زلف کو کھولے ہوئے لیلائے شب آئی
پردیس میں سادات پہ آفت عجب آئی
فریاد کناں روحِ امیرِ عرب آئی
غل تھا کہ شبِ قتلِ شہ تشنہ لب آئی
سادات کو کیا کیا غمِ جاں کاہ دکھائے
رات ایسی مصیبت کی نہ اللہ دکھائے

صدمے سے ہوا رنگِ رُخِ ماہ جو کافور
اختر بھی بنے مردمکِ دیدۂ بے نور
غم چھا گیا، راحت دلِ عالم سے ہوئی دور
تصویرِ الم بن گئی جنت میں ہر اک حور
کہتے تھے ملک "رات نہ ہوئے گی اب ایسی"
تاروں نے بھی دیکھی نہ تھی تاریک شب ایسی

تھا خانۂ غم خیمۂ شاہنشہ والا
آندھی یہ پریشاں تھی، کہ دل تھے تہ و بالا
مشعل نہ ٹھہرتی تھی، نہ شمعوں کا اجالا
خیمہ بھی اندھیرے میں نظر آتا تھا کالا
خاک اُڑتی تھی منھ پر حرمِ شیرِ خدا کے
تھا چیں بہ جبیں فرش بھی جھونکوں سے ہوا کے

جنگل کی ہوا اور درندوں کی صدائیں
تھراتی تھیں بچوں کو چھپائے ہوئے مائیں
دھڑکا تھا کہ دہشت سے نہ جانیں کہیں جائیں
ڈرتی تھی کوئی، اور کوئی پڑھتی تھی دُعائیں
گودوں میں بھی راحت نہ ذرا پاتے تھے بچّے
جب بولتے تھے شیر تو ڈر جاتے تھے بچّے

تھی سب سے سوا بنتِ علی مضطر و بے تاب
فق ہو گیا تھا شام سے منھ صورتِ مہتاب
مژگاں سے رُخِ پاک پہ تھی بارشِ خونناب
تلوار کلیجے پہ چلے جب تو کہاں تاب

اِک کرب تھا بسمل کی طرح جانِ حزیں پر
اُٹھتی تھی کبھی، اور کبھی گرتی تھی زمیں پر

حسینی دربار

تھے دوسرے خیمے میں اُدھر سبطِ پیمبر
دربار میں حاضر تھے رفیقانِ دلاور
اِک پہلو میں قاسم تھے اور اِک پہلو میں اکبر
اکبر کے اُدھر لختِ دلِ زینبِ مضطر

شبیر محبت سے سخن کرتے تھے سب سے
عبّاس علی سامنے بیٹھے تھے ادب سے

سرگرم تھے مرجانے پہ سب شاہ کے انصار
عبّاس سے فرماتے تھے حضرت بہ دلِ زار
"تم رہیو ذرا خیمۂ ناموس سے ہشیار"
آوازِ بکا خیمے سے آنے لگی اِک بار

اکبر سے کہا آپ نے مڑکر کہ "یہ کیا ہے"
کی عرض "پھپھی جان کے رونے کی صدا ہے

اہلِ حرم کی بے قراری

یوں تو کئی راتوں سے وہ ہیں مضطر و بے تاب
راحت کی نہ صورت ہے، نہ آرام کے اسباب
غش میں جو ذرا بند ہوئے دیدۂ پُر آب
روتی ہوئی چونکی ہیں ابھی دیکھ کے کچھ خواب

نعلین کہیں، چادرِ پُر نور کہیں ہے
اُس وقت سے بسمل کی طرح چین نہیں ہے

"سب رو رہی ہیں بی بیاں بچوں کو لیے پاس
ایک ایک کو اندیشہ ہے، ایک ایک کو وسواس
جو پوچھتا ہے وجہ، تو کہتی ہیں بصد یاس
"لوگو! مجھے شبیر کے بچنے کی نہیں آس

مانگو یہ دعا غیب سے بے کس کی مدد ہو
صدقے کرو مجھ کو کہ بلا بھائی کی رد ہو"

"اُن کا تو یہ احوال ہے، امّاں کا یہ عالم اشکوں کی جھڑی آنکھوں سے تھمتی نہیں اک دم
صغرا کی بھی ہے فکر، سکینہ کا بھی ہے غم چھ ماہ کا بچہ بھی ہوا جاتا ہے بے دم
گودی میں اُٹھائیں اُسے، یا اس کو سنبھالیں
دو دو کے فاقے میں وہ کس کس کو سنبھالیں

"رو آتی ہیں عابد کے سرہانے کبھی جا کر گہوارۂ اصغر پہ کبھی گرتی ہیں آ کر
قرآں کی ہوا دیتی ہیں غش میں اُسے پا کر بہلاتی ہیں بیٹی کو کبھی اشک بہا کر
وہ کہتی ہے "تا صبح یونہی روؤں گی امّاں
بابا ہی جب آویں گے تو میں سوؤں گی امّاں

"بتلاؤ شہ جن و بشر کیوں نہیں آتے اب رات بہت کم ہے پدر کیوں نہیں آتے
آزردہ ہیں کچھ مجھ سے؟ ادھر کیوں نہیں آتے کیا آج وہیں سوئیں گے، گھر کیوں نہیں آتے؟
اب پیاس کی فریاد بھی بابا نہیں سنتے
حضرت مرے رونے کی صدا کیا نہیں سنتے؟"

رو کر علی اکبر نے جو کی شہ سے یہ تقریر داخل ہوئے خیمے میں بہ عجلت شہ دل گیر
دیکھی جو نہ تھی دیر سے وہ چاند سی تصویر قدموں پہ محبت سے گری دوڑ کے ہمشیر
بے تاب جو پایا بہت اُس تشنہ دہن کو
شبیر نے لپٹا لیا چھاتی سے بہن کو

امام کی اپنی بہن سے گفتگو

فرمایا "بہن! تم نے بنایا ہے یہ کیا حال نہ سر پہ عصابہ ہے، نہ چادر ہے، نہ رومال
ماتھا ہے بھرا خاک میں، بکھرے ہوئے ہیں بال بیٹھو نہ، کہ جیتا ہے ابھی فاطمہ کا لال
دم تن سے مرا گھٹ کے نکل جائے گا زینب
رو لیجیو، جب رونے کا وقت آئے گا زینب

"جیتا ہوں میں اور آہ ابھی سے یہ تلاطم — یہ کرب، یہ دکھ درد، یہ زاری، یہ تظلم
ہوتے ہیں مرے ہوش و حواس آئے ہوئے گم — خنجر کے تلے دیکھو گی کس طرح مجھے تم؟
بس صبر کرو، جی سے گزر جائیں گے بچے
تڑپو گی تم اس طرح تو مر جائیں گے بچے

"تلوار کسی نے ابھی تولی نہیں مجھ پر — سینہ ابھی تیروں سے مُشبک نہیں خواہر
گردن پہ کسی نے ابھی پھیرا نہیں خنجر — مر جائے گا بھائی تمھیں ثابت ہوا کیونکر
ہرچند کہ ساعت نہیں ٹلتی ہی قضا کی
بچ جاؤں تو کیا دُور ہی قدرت سے خدا کی"

زینب نے کہا "خوش ہوں جو میری اجل آئے — بھائی! تمھیں اللہ اس آفت سے بچائے
خالق مجھے عابد کی یتیمی نہ دکھائے — بھائی کی بلا لے کے بہن خلق سے جائے
وسواس طبیعت کو بہلنے نہیں دیتا
مجبور ہوں دل مجھ کو سنبھلنے نہیں دیتا

"آتا ہی سکینہ کی یتیمی کا مجھے دھیان — ہر وقت بھرا گھر نظر آجاتا ہی ویران
سمجھانے سے کچھ دل جو بہلتا ہی میں قربان! — پھر جاتا ہی آنکھوں کے تلے موت کا سامان
بازو مرے کسنے کو رسن لاتا ہی کوئی
سر پر سے ردا چھینے لیے جاتا ہی کوئی

"منھ ڈھانپ کے بستر پہ جو سو جاتی ہوں دم بھر — تو چاک گریباں نظر آتے ہیں پیمبر
اماں کبھی چلاتی ہیں یوں کھولے ہوئے سر — بیٹی! نہ بچے گا ترا مظلوم برادر
کیا لیٹی ہی بستر پہ، کدھر دھیان ہی زینب
شبیر اسی رات کا مہمان ہی زینب"

سکینہ تو — یہ ذکر ابھی تھا کہ سکینہ نے پکارا — "سونا تو گیا آپ کے ہمراہ ہمارا
سمجھا!! — میں جاگتی ہوں، ورجہاں سوتا ہے سارا — گردوں پہ چمکنے نہ لگے صبح کا تارا
نیند آئی ہے بیٹی کو سُلا جائیے بابا
بس ہو چکیں باتیں، اب ادھر آئیے بابا"

حضرت نے کہا "میں تری آواز کے قربان — اللہ تم اب تک نہیں سوئی ہو مری جان!
غربت میں کہاں یہ راحت و آرام کا سامان — بن باپ کے تم کو تو نہیں چین کسی آن
اچھی نہیں عادت یہ، نہ رویا کرو بی بی
پہلو میں کبھی ماں کے بھی سویا کرو بی بی

"کیا ہے جو ہم گھر میں کسی شب کو نہ آئیں — مجبور ہوں ایسے کہ تمہیں چھوڑ کے جائیں
تم پاؤ نہ ہم کو، نہ تمہیں ہم کہیں پائیں — بی بی کہو، پھر چھاتی پہ کس طرح سلائیں
جنگل میں بہت قافلے لٹ جاتے ہیں بی بی
برسوں جو رہے ساتھ وہ چھٹ جاتے ہیں بی بی

"جب عمر تھی کم، ہم بھی چھٹے تھے یونہی ماں سے — سوتے تھے لپٹ کر یونہی خاتونِ جہاں سے
کوچ اُن کا ہوا سامنے آنکھوں کے جہاں سے — ماتم سے ملیں وہ، نہ بکا سے، نہ فغاں سے
یہ داغ، یہ اندوہ و الم، سب کے لیے ہیں
ماں باپ زمانے میں سدا کس کے جیے ہیں؟

"رستہ وہ اجل کا ہے کہ ہوتا ہی نہیں بند — کوچ آج پدر کا ہے، تو کل جائے گا فرزند
ہوتا ہے قلق فرقتِ اولاد کا دہ چند — کیا زور ہے بندے کا، جو مرضیِ خداوند
جو آئے ہیں دنیا میں وہ سب کوچ کریں گے
اس زیست کا انجام یہی ہے کہ مریں گے"

صبحِ عاشورا

جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے
جلوہ کیا سحر کے رُخ بے حجاب نے
دیکھا سوئے فلک شہِ گردوں رکاب نے
مُڑ کر صدا رفیقوں کو دی اُس جناب نے

"آخر ہے رات، حمد و ثنائے خدا کرو
اُٹھو، فریضۂ سحری کو ادا کرو

ہاں غازیو! یہ دن ہے جدال و قتال کا
یاں آج خوں بہے گا محمدؐ کی آل کا
چہرہ خوشی سے سُرخ ہے زہراؑ کے لال کا
گزری شبِ فراق، دن آیا وصال کا

ہم وہ ہیں، غم کریں گے ملک جن کے واسطے
راتیں تڑپ کے کاٹی ہیں اس دن کے واسطے

یہ صبح ہے وہ صبح مُبارک ہے جس کی شام
یاں سے ہوا جو کوچ، تو ہے خلد میں مقام
کوثر پہ آبرو سے پہنچ جائیں تشنہ کام
لکھے خدا نماز گزاروں میں سب کے نام

سب ہیں وحیدِ عصر، یہ غُل چار سو اُٹھے
دنیا سے جو شہید اُٹھے، سُرخ رو اُٹھے"

یہ سُن کے بستروں سے اُٹھے وہ خدا شناس
اِک اِک نے زیبِ جسم کیا فاخرہ لباس
شانے محاسنوں میں کیے سب نے بے ہراس
باندھے عمامے، آئے امامِ زماں کے پاس

رنگیں عبائیں دوش پہ، کمریں کسے ہوئے
مشک و زباد و عطر میں کپڑے بسے ہوئے

شہادت کی خوشی

سوکھے لبوں پہ حمدِ الٰہی، رُخوں پہ نور — خوف و ہراس و رنج و کدورت دلوں سے دور
فیاض و حق شناس و اولوالعزم و ذی شعور — خوش فکر و بذلہ سنج و ہنر پرور و غیور
کانوں کو حسنِ صوت سے حظ برملا ملے
باتوں میں وہ نمک کہ دلوں کو مزا ملے

لب پر ہنسی، گلوں سے زیادہ شگفتہ رو — پیدا تنوں سے پیرہنِ یوسفی کی بو
پرہیزگار و زاہد و ابرار و نیک خو — غلماں کے دل میں جن کی غلامی کی آرزو
پتھر میں ایسے لعل، صدف میں گہر نہیں
حوروں کا قول تھا، یہ ملک ہیں بشر نہیں

صبح کا سماں

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور — دیکھے، تو غش کرے ارنی گوئے اوجِ طور
پیدا گلوں سے قدرتِ اللہ کا ظہور — وہ جابجا درختوں پہ تسبیح خوانِ طیور
گلشن خجل تھے وادیٔ مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دم بہ دم — مرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تابِ نہر، وہ موجوں کا پیچ و خم — سردی ہوا میں، پر نہ زیادہ بہت، نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

وہ پھولنا شفق کا، وہ مینائے لاجورد — مخمل سی وہ گیاہ، وہ گلہائے سرخ و زرد
رکھتی تھی پھونک کر قدم اپنا ہوائے سرد — یہ خوف تھا کہ دامنِ گل پر پڑے نہ گرد
دھوتا تھا دل کے داغ چمن لالہ زار کا
سردی جگر کو دیتا تھا سبزہ کچھار کا

ٹھنڈی ہوا میں سبزۂ صحرا کی وہ لہک — شرمائے جس سے اطلسِ زنگاریِ فلک
وہ جھومنا درختوں کا، پھولوں کی وہ مہک — ہر برگِ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک
ہیرے خجل تھے، گوہرِ یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

قربانِ صنعتِ قلمِ آفرینش گار — تھی ہر ورق سے صنعتِ ترصیع آشکار
عاجز ہے فکرتِ شعرائے ہنر شعار — ان صنعتوں کو پائے کہاں عقلِ سادہ کار
عالم تھا محوِ قدرتِ ربِّ عباد پر
مینا کیا تھا وادیِ مینو سواد پر

وہ نور، اور وہ دشت سہانا سا، وہ فضا — دُرّاج و کبک و تیہو و طاؤس کی صدا
وہ جوشِ گل، وہ نالۂ مرغانِ خوش نوا — سردی جگر کو بخشتی تھی صبح کی ہوا
پھولوں سے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے
تھالے بھی نخل کے سبدِ گل فروش تھے

وہ دشت، وہ نسیم کے جھونکے، وہ سبزہ زار — پھولوں پہ جابجا وہ گہرہائے آب دار
اُٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار — بالائے نخل ایک جو بلبل، تو گل ہزار
خواہاں تھے زہرِ گلشنِ زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

وہ قمریوں کا چار طرف سرو کے ہجوم — کوکو کا شور، نالۂ حق سرّہٗ کی دھوم،
سبحان ربنا کی صدا تھی علی العموم — جاری تھے وہ، جو اُن کی عبادت کے تھے رسوم
کچھ گل فقط نہ کرتے تھے ربِّ علا کی حمد
ہر خار کو بھی نوکِ زباں تھی خدا کی حمد

چیونٹی بھی ہاتھ اُٹھا کے یہ کہتی تھی بار بار — اَے دانہ کش ضعیفوں کے رازق! ترے نثار
یا حیُّ و یا قدیر کی تھی ہر طرف پُکار — تہلیل تھی کہیں، کہیں تسبیحِ کردگار

طائر ہوا میں محو، ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر ہونک رہے تھے کچھار میں

کانٹوں کے بیچ میں تھے ریاضِ نبی کے پھول — خوشبو سے جن کی خلد تھا جنگل کا عرض و طول
دُنیا کی زیب، زینتِ کاشانۂ بتول — وہ باغ تھا، لگا گئے تھے خود جسے رسول

اِس باغ سے زمیں کا فلک پر دماغ تھا
رضواں بھی جس پہ رشک کرے، یہ وہ باغ تھا

اللہ رى خزاں کے دن اُس باغ کی بہار — پھولے سماتے تھے نہ محمدؐ کے گُل عذار
دولھا بنے ہوئے تھے، اجل تھی گلوں کا ہار — جاگے وہ ساری رات کے، وہ نیند کا خمار

راہیں تمام جسم کی خوشبو سے بس گئیں
جب مُسکرائے، پھولوں کی کلیاں بکھر گئیں

امام حسین کا خیمہ

وہ دشت، اور وہ خیمۂ زنگار گوں کی شان — گویا زمیں پہ نصب تھا اک تازہ آسمان
بے چوبہ سپہرِ بریں جس کا سائبان — بیت العتیق، دیں کا مدینہ، جہاں کی جان

اللہ کے حبیب کے پیارے اِسی میں تھے
سب عرشِ کبریا کے ستارے اِسی میں تھے

گیسوے حورِ خلد کی ہمسر ہر اک طناب — دریا تھا وہ، تو گنبدِ گردوں تھا اک حباب
وہ شان، وہ شکوہ، وہ رفعت، وہ آب و تاب — شمسے سے جس کے آنکھ چراتا تھا آفتاب

پڑھتا درود آ کے ملائک کا وِرد تھا
سائے کے بدلے نور قناتوں کے گرد تھا

وہ اَوج اور وہ قُبّۂ پُر نور کی جھلک
ضَو نور کی زمین سے تھی آسماں تلک
دب دب کے سر جھکاتا تھا بے چُونہ فلک
اُٹھ اُٹھ کے دیکھتے تھے اُسے عرش سے ملک

خوشبو سے ہر بشر کا معطر دماغ تھا
وسعت سے اُس کی صحن کا دل باغ باغ تھا

تھا وہ سپہر دیں، تو ہر اک چوب رُکنِ دیں
بہتر میں اُس کے دَور سے تھا چرخ ہفتمیں
تھا در پہ بابِ گلشنِ فردوس کا یقیں
پردے تھے رشکِ پردۂ چشمانِ حورعیں

جلوے سے حسن روئے شہِ کائنات کے
آئینہ ہائے نور تھے نقشے قنات کے

خیمے سے نکلے شہ کے عزیزانِ خوش خصال
جن میں کئی تھے حضرتِ خیر النسا کے لال
قاسم سا گل بدن، علی اکبر سا خوش جمال
اک جا عقیل و مسلم و جعفر کے نونہال

سب کے رخوں کا نور سپہر بریں پہ تھا
اٹھارہ آفتابوں کا غنچہ زمیں پہ تھا

نماز کی تیاری

پانی نہ تھا وضو جو کریں وہ فلک جناب
پر تھی رخوں پہ خاکِ تیمم سے طرفہ آب
باریک ابر میں نظر آتے تھے آفتاب
ہوتے ہیں خاکسار غلامانِ بوتراب

مہتاب سے رخوں کی صفا اور ہو گئی
مٹی سے آئینوں میں جلا اور ہو گئی

ناگاہ چرخ پر خطِ ابیض ہوا عیاں
تشریف جانماز پہ لائے شہِ زماں
سجادے بچھ گئے عقبِ شاہِ انس و جاں
صوت حسن سے اکبر مہرو نے دی اذاں

علی اکبر کی اذان

ہر اک کی چشم آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی
گویا صدا رسول کی کانوں میں آ گئی

چپ تھے طیور، جھومتے تھے وجد میں شجر　　تسبیح خواں تھے برگ و گُل و غنچہ و ثمر
محوِ ثنا کلوخ و نباتات و دشت و در　　پانی سے مُنھ نکالے تھے دریا کے جانور
اعجاز تھا کہ دلبرِ شبیر کی صدا
ہر خشک و تر سے آتی تھی تکبیر کی صدا

ناموسِ شاہ خیمے میں روتے تھے زار زار　　چُپکی کھڑی تھی ڈیوڑھی پہ بانوے نامدار
زینب بلائیں لے کے یہ کہتی تھی بار بار　　"صدقے نمازیوں کے، مؤذن کے میں نثار
کرتے ہیں یوں ثنا و صفت ذوالجلال کی
لوگو! اذاں سُنو مرے یوسف جمال کی

"یہ حُسنِ صوت، اور یہ قرأت، یہ شدّ و مد　　حقّا کہ افصح الفصحا ہیں انھیں کا جد
گویا ہے لحنِ حضرتِ داؤدِ باخرد　　یارب رکھ اس صدا کو زمانے میں تا ابد
شعبے صدا میں پنکھڑیاں جیسے پھول میں
بلبل چہک رہا ہے ریاضِ رسول میں"

نماز اور نمازی

صف میں ہوا جو نعرۂ قد قامتِ الصّلوٰۃ　　قائم ہوئی نماز، اُٹھے شاہِ کائنات
وہ نور کی صفیں، وہ مصلّی ملک صفات　　قدموں سے جن کے ملتی تھی آنکھیں رہِ نجات
جلوہ تھا تا بہ عرشِ معلّٰے حسین کا
مصحف کی لوح تھی کہ مصلّٰے حسین کا

قرآں کھلا ہوا کہ جماعت کی تھی نماز　　بسم اللہ جیسے آگے ہو، یوں تھے شہِ حجاز
سطریں تھیں یا صفیں عقبِ شاہِ سرفراز　　کرتی تھی خود نماز بھی اُن کی ادا پہ ناز
صدقے سحر بیاض پہ بین السطور کی
سب آیتیں تھیں مصحفِ ناطق کے نور کی

باہم تکبروں کی صدائیں وہ دل پسند — کرّوبیانِ عرش تھے سب جن سے بہرہ مند
ایماں کا نور چہروں پہ تھا چاند سے دوچند — خوفِ خدا سے کانپتے تھے سب کے بند بند
خم گردنیں تھیں سب کی خضوع و خشوع میں
سجدوں میں چاند تھے، مہِ نو تھے رکوع میں

فارغ ہوئے نماز سے جب قبلۂ انام — آئے مصافحے کو جوانانِ تشنہ کام
چومے کسی نے دستِ شہنشاہِ خاص و عام — آنکھیں ملیں کسی نے قدم پر بہ احترام
کیا دل تھے، کیا سپاہ رشید و سعید تھی
باہم معانقے تھے، کہ مرنے کی عید تھی

طلوعِ آفتاب

آمد وہ آفتاب کی، وہ صبح کا سماں — تھی دشتِ کربلا کی زمیں رشکِ آسماں
ذروں کی روشنی پہ ستاروں کا تھا گماں — نہرِ فرات بیچ میں تھی مثلِ کہکشاں
ہر نخل پر ضیائے سرِ کوہِ طور تھی
گویا فلک سے بارشِ بارانِ نور تھی

اوجِ زمیں سے پست تھا چرخِ زبرجدی — کوسوں تھا سبزہ زار سے صحرا زمردی
ہر خشک و تر پہ تھا کرمِ بحرِ سرمدی — بے آب تھے مگر دُرِ دریائے احمدی
روکے ہوئے تھی نہر کو اُمت رسول کی
سبزہ ہرا تھا خشک تھی کھیتی بتول کی

تھا بس کہ روزِ قتلِ شہِ آسماں جناب — نکلا تھا خوں ملے ہوئے چہرے پہ آفتاب
تھی نہرِ علقمہ بھی خجالت سے آب آب — روتا تھا پھوٹ پھوٹ کے دریا میں ہر حباب
پیاسی جو تھی سپاہِ خدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

یزیدی فوج میں جنگ کی تیاریاں

ہے لشکرِ یزید میں سامانِ قتلِ شاہ — ہر سو جما رہا ہے صفیں شمرِ روسیاہ
گیتی کو تہلکہ ہے، یہ ہے کثرتِ سپاہ — ممکن نہیں کہ ہو گزرِ طائرِ نگاہ
سب مستعد ہیں قتلِ شہِ کائنات پر
طوفانِ آب تیغ اٹھا ہے فرات پر

ہر صف میں برچھیوں کی چمک ہے کہ الحذر — چمکا رہے ہیں ڈانڈ سوارانِ خیرہ سر
وہ بوڑیاں جو سنگ کے دل میں کریں گزر — انیاں وہ توڑ ڈالیں جو فولاد کا جگر
ہر اک گلا تو خنجرِ بے پیر کے لیے
یہ برچھیاں ہیں سب تنِ شبیر کے لیے

ناوک فگن لیے ہوئے حلقے کمان کے — چلاتے ہیں یہ چھاتیوں کو تان تان کے
"دشمن ہیں بادشاہِ دو عالم کی جان کے — دم لیں گے جسمِ شاہ کو تیروں سے چھان کے
ہرگز کریں گے پاس نہ احمد کی آل کا
ریتی پہ خوں بہائیں گے زہرا کے لال کا"

حسینی جاں بازوں میں عزمِ جہاد

حاضر ادھر بھی ہیں درِ دولت پہ جاں نثار — اک سو ٹہل رہے ہیں رفیقانِ ذی وقار
پیدل کھڑے ہیں سامنے باندھے ہوئے قطار — بیٹھے ہیں زین پوش کھچائے ہوئے سوار
شوقِ زیارتِ علمِ فوجِ شاہ ہے
ایک اک کی جانب درِ دولت نگاہ ہے

رخ ہر کسی کا جوشِ شجاعت سے لالہ رنگ — کوئی سنوارتا ہے بدن پر سلاحِ جنگ
جھک جھک کے چست کرتا ہے کوئی فرس کا تنگ — چلے سے جوڑتا ہے کوئی فاقہ کش خدنگ
بھالا سنبھالتا ہے کوئی جھوم جھوم کے
تکتا ہے کوئی تیغ کے قبضے کو چوم کے

ملتا ہے ہم نفس کے ایک جواں ایک کے گلے — ساری خوشی یہ ہے کہ بس اب خلد میں چلے
چہرے وہ سرخ سرخ، وہ جرأت کے ولولے — حق سے یہ التجا کہ نہ رن سے قدم ٹلے
مر کر بھی دل میں الفتِ حیدر کی بو رہے
پانی ہمیں ملے نہ ملے آبرو رہے

حق کے ولی، مصاحبِ سردارِ انس و جن — کوئی جواں، کوئی متوسط، کوئی مسن
فاقوں میں باحواس، لڑائی میں مطمئن — کہتے ہیں روزِ قتل ہمیں عید کا ہے دن
مانگو دعا کہ آج کا مرنا سعید ہو
قربان ہوں حسین پہ رن میں، تو عید ہو

وہ گورے گورے جسم، قبائیں وہ تنگ تنگ — جن کی صفا کو دیکھ کے ہو آئینہ بھی دنگ
زیور کی طرح جسم پہ زیبا سلاحِ جنگ — جرأت کا ہے یہ جوش کہ چہرے ہیں لالہ رنگ
کہتے ہیں سب چڑھائے ہوئے آستین کو
آقا ابھی کہیں، تو الٹ دیں زمین کو

ہیں اک طرف عزیزِ شہِ آسماں وقار — ہے جن کی چاہ میں دلِ یوسف بھی بے قرار
جاں باز، سرفروش، بہادر، وفا شعار — ایک ایک روشِ چمنستانِ روزگار
ہر چند باغِ دہر کو کیا کیا ملا نہیں
اب تک تو اس روش کا کوئی گل کھلا نہیں

خلق و مروتِ حسنی ان پہ ختم ہے — حسن ان پہ ختم، گل بدنی ان پہ ختم ہے
زور ان پہ ختم، تیغ زنی ان پہ ختم ہے — ہر معرکے میں صف شکنی ان پہ ختم ہے
غازی ہیں، صف شکن ہیں، جری ہیں، دلیر ہیں
جس میں علی رہے اسی بیشے کے شیر ہیں

حاضر ہے ذوالجناح شہنشاہِ بحر و بر — کلغی ہے، یا کہ خوشۂ پروین قریبِ سر
خادم چنور لیے ہیں مگس راں اِدھر اُدھر — پیچھے ہیں بادپائے عزیزانِ نامور
گھوڑے سمند سرورِ ذی شاں کے ساتھ ہیں
پریوں کے غول تختِ سلیماں کے ساتھ ہیں

اہلِ حرم کا اضطراب

خیمے میں آئے شہ، تو یہ دیکھا حرم کا حال — چہرے تو فق ہیں اور کھلے ہیں سروں کے بال
زینب کی یہ دعا ہے کہ ”اے ربِّ ذوالجلال! — بچ جائے اس فساد سے خیرالنسا کا لال
بانوے نیک نام کی کھیتی ہری رہے
صندل سے مانگ، بچوں سے گودی بھری رہے

”آفت میں ہے مسافرِ صحرائے کربلا — بے کس پہ یہ چڑھائی ہے، سیّد پہ یہ جفا
غربت میں ٹھن گئی جو لڑائی تو ہوگا کیا — ان ننھے ننھے بچوں پہ کر رحم اے خدا!
فاقوں سے جاں بلب ہیں عطش سے ہلاک ہیں
یارب! ترے رسول کی یہ آلِ پاک ہیں

”سر پر ہیں اب علی نہ رسولِ فلک وقار — گھر لٹ گیا، گزر گئیں خاتونِ روزگار
اماں کے بعد رو چکی حسنؑ کو میں سوگوار — دنیا میں اب حسین ہے ان سب کا یادگار
تو داد دے مری کہ عدالت پناہ ہے
کچھ اس پہ بن گئی، تو یہ مجمع تباہ ہے“

بولے قریب جا کے شہِ آسماں جناب — ”مضطر نہ ہو، دعائیں ہیں تم سب کی مستجاب
مغرور ہیں، خطا پہ ہیں، یہ خانماں خراب — خود جا کے میں دکھاتا ہوں ان کو رہِ صواب
موقع نہیں بہن ابھی فریاد و آہ کا
لاؤ تبرکات رسالت پناہ کا

امام حسین کا لباس اور اسلحہ

معراج میں رسول نے پہنا تھا جو لباس — کشتی میں لائیں زینب اُسے شاہِ دیں کے پاس
سر پر رکھا عمامۂ سردارِ حق شناس — پہنی قبائے پاکِ رسولِ فلک اساس
بر میں درست و چُست تھا جامہ رسول کا
رومال فاطمہ کا، عمامہ رسول کا

شملے کے دو سرے جو پڑے تھے بصد وقار — ثابت یہ تھا کہ دوش پہ گیسو پڑے ہیں چار
بل کھا رہا تھا زلفِ سمن بو کا تار تار — جس کے ہر ایک مو پہ خطا و ختن نثار
مشک و عبیر و عود اگر ہیں، تو ہیچ ہیں
سنبل پہ کیا کھلیں گے، یہ گیسو کے پیچ ہیں

کپڑوں سے آ رہی تھی رسولِ زمن کی بو — دولھا نے سونگھی ہوگی نہ ایسی دُلھن کی بو
حیدر کی، فاطمہ کی، حسین و حسن کی بو — پھیلی ہوئی تھی چار طرف پنجتن کی بو
لنڈھتا تھا عطر وادیٔ عنبر سرشت میں
گُل جھومتے تھے باغ میں، رضواں بہشت میں

صندوق اسلحہ کے جو کھلوائے شاہ نے — آنسو بہائے زینبِ عصمت پناہ نے
پہنی زرہ امام فلک بارگاہ نے — بازو پہ جوشنین پڑھے عز و جاہ نے
جوہر بدن کے حسن سے سارے چمک گئے
حلقے تھے جتنے، اُتنے ستارے چمک گئے

یاد آ گئے علی نظر آئی جو ذوالفقار — قبضے کو چوم کر شہِ دیں روئے زار زار
تولی جو لے کے ہاتھ میں شمشیر آب دار — شوکت نے دی صدا کہ تری شان کے نثار
فتح و ظفر قریب ہو، نصرت قریب ہو
زیب اس کی تجھ کو، ضربِ عدو کو نصیب ہو

باندھی کمر سے تیغ جو زہرا کے لال نے پھاڑا افلاک پہ اپنا گریباں ہلال نے
دستانے پہنے سرورِ قدسی خصال نے معراج پائی دوش پہ حمزہ کی ڈھال نے
رُتبہ بلند تھا، کہ سعادت نشان تھی
ساری سپر میں مہرِ نبوت کی شان تھی

عون و محمد کو علم داری کی خواہش اور حضرت زینب کی فہمائش

ہتھیار اِدھر لگا چکے آقائے خاص و عام تیار اُدھر ہوا علمِ سیدّ الانام
کھولے سروں کو گرد تھیں سیدانیاں تمام روتی تھی تھامے چوبِ علم خواہرِ امام
تیغیں کمر میں دوش پہ شملے پڑے ہوئے
زینب کے لال زیرِ علم آ کھڑے ہوئے

گردانے دامنوں کو قبا کے وہ گل عذار مرفق تک آستینوں کو اُلٹے بصد وقار
جعفر کا رُعب، دبدبۂ شیر کردگار بوٹا سے اُن کے قد، پہ نمودار و نامدار
آنکھیں ملیں علم سے پھریرے کو چوم کے
رایت کے گرد پھرنے لگے جھوم جھوم کے

گہہ ماں کو دیکھتے تھے کبھی جانبِ علم نعرہ کبھی یہ تھا کہ نثارِ شہِ اُمم
کرتے تھے دونوں بھائی کبھی مشورے بہم آہستہ پوچھتے کبھی ماں سے وہ ذی حشم
"کیا قصد ہے علی ولی کے نشان کا؟
اماں کسے ملے گا علم نانا جان کا؟

کچھ مشورہ کریں جو شہنشاہ خوش خصال ہم بھی محق ہیں، آپ کو اس کا رہے خیال
پاسِ ادب سے عرض کی ہم کو نہیں مجال اس کا بھی خوف ہے کہ نہ ہو آپ کو ملال
آقا کے ہم غلام ہیں اور جاں نثار ہیں
عزت طلب ہیں، نام کے اُمیدوار ہیں

بے مثل تھے رسول کے لشکر کے سب جواں
لیکن ہمارے جد کو نبی نے دیا نشاں
خیبر میں دیکھتا رہا منھ لشکرِ گراں
پایا مگر علی نے علم وقتِ امتحاں
طاقت میں کچھ کمی نہیں گو بھوکے پیاسے ہیں
پوتے انھیں کے ہم ہیں، انھیں کے نواسے ہیں"

زینب نے تب کہا کہ "تمھیں اس سے کیا ہے کام
کیا دخل مجھ کو، مالک و مختار ہیں امام
دیکھو نہ کیجو بے ادبانہ کوئی کلام
بگڑوں گی میں، جو لوگے زباں سے علم کا نام
لو جاؤ بس، کھڑے ہو الگ ہاتھ جوڑ کے
کیوں آئے تم یہاں علی اکبر کو چھوڑ کے؟

"عمریں قلیل اور ہوس منصبِ جلیل
اچھا نکالو قد کے بھی بڑھنے کی کچھ سبیل
ماں صدقے جائے گرچہ یہ ہمت کی ہے دلیل
ہاں! اپنے ہم سنوں میں تمھارا نہیں عدیل
لازم ہے سوچے، غور کرے، پیش و پس کرے
جو ہو سکے نہ، کیوں بشر اس کی ہوس کرے

"ان ننھے ننھے ہاتھوں سے اٹھے گا یہ علم؟
چھوٹے قدوں میں سب سے، سنوں میں سبھوں سے کم
نکلیں تنوں سے سبطِ نبی کے قدم پہ دم
عہدہ یہی ہے بس، یہی منصب، یہی حشم
رخصت طلب اگر ہو، تو یہ میرا کام ہے
ماں صدقے جائے آج تو مرنے میں نام ہے

"پھر تم کو کیا، بزرگ تھے گر فخرِ روزگار
زیبا نہیں ہے وصفِ اضافی پہ افتخار
جوہر وہ ہیں، جو تیغ کرے آپ آشکار
دکھلا دو آج حیدر و جعفر کی کارزار
تم کیوں کہو کہ شیرِ خدا کے ولی کے ہیں
فوجیں پکاریں خود کہ نواسے علی کے ہیں

"کیا کچھ علم سے جعفرِ طیار کا تھا نام؟ — یہ بھی تھی اک عطائے رسولِ فلک مقام
بگڑی ہی لڑائیوں میں بن آئی اُنھیں سے کام — جب کھینچتے تھے تیغ تو ہلتا تھا روم و شام
بے جاں ہوئے تو نخلِ وَغا نے ثمر دیے
ہاتھوں کے بدلے حق نے جواہر کے پَر دیے

"لشکر نے تین روز ہزیمت اُٹھائی جب — بخشا علم رسولِ خدا نے علی کو تب
مرحب کو قتل کر کے بڑھا جب وہ شیرِ رب — در بند کر کے قلعے کا بھاگی سپاہ سب
اُکھڑا وہ یوں، گراں تھا جو در سنگِ سخت سے
جس طرح توڑے کوئی پتّا درخت سے

"نرغے میں تین دن سے ہے مشکل کشا کا لال — اماں کا باغ ہوتا ہے جنگل میں پائمال
پوچھا نہ یہ، کہ کھولے ہیں کیوں تم نے سر کے بال — میں لٹ رہی ہوں اور تمھیں منصب کا ہے خیال
غم خوار تم مرے ہو، نہ عاشق امام کے
معلوم ہو گیا مجھے، طالب ہو نام کے"

امام کا بہن سے مشورہ

زینب کے پاس آ کے یہ بولے شہِ زمن — "بچوں کی جرأتوں پہ نظر تم نے کی بہن؟
شیروں کے شیر، عاقل و جرار و صف شکن — زینب! وحیدِ عصر ہیں یہ دونوں گل بدن
یوں دیکھنے کو سب میں بزرگوں کے طور ہیں
تیور ہی ان کے اور، ادا ہی اور ہیں

"نو دس برس کے سن میں یہ جرأت، یہ ولولے — بچّے کسی نے دیکھے ہیں ایسے بھی سن چلے
اقبال کیونکر ان کے نہ قدموں سے منہ ملے — کس گود میں بڑے ہوئے، کس دودھ سے پلے
بے شک یہ ورثہ دارِ جنابِ امیر ہیں
پر کیا کروں کہ دونوں کی عمریں صغیر ہیں

"اب تم جسے کہو اُسے دیں فوج کا علم" کی عرض جو صلاح شہِ آسماں حشم"
فرمایا "جب سے اُٹھ گئیں زہرائے با کرم اُس دن سے تم کو ماں کی جگہ جانتے ہیں ہم
مالک ہو تم، بزرگ کوئی ہو، کہ خرد ہو
جس کو کہو، اُسی کو یہ عہدہ سپرد ہو"

بولی بہن کہ "آپ بھی تو لیں کسی کا نام ہے کس طرف توجہ سردار خاص و عام
قرآں کے بعد ہے بھی تو ہے آپ کا کلام گر مجھ سے پوچھتے ہیں شہ آسماں مقام
شوکت میں، قد میں، شان میں، ہمسر کوئی نہیں
عباس نامدار سے بہتر کوئی نہیں

"عاشق، غلام، خادمِ دیرینہ، جاں نثار فرزند، بھائی، زینتِ پہلو، وفا شعار
راحت رساں، مطیع، نمودار، نامدار جرار، یادگارِ پدر، فخرِ روزگار
صفدر ہے، شیر دل ہے، بہادر ہے، نیک ہے
بے مثل سیکڑوں میں، ہزاروں میں ایک ہے"

آنکھوں میں اشک بھر کے یہ بولے شہِ زمن "ہاں تھی یہی علی کی وصیت بھی اے بہن!
اچھا، بلائیں آپ، کدھر ہے وہ صف شکن؟" اکبر چچا کے پاس گئے، سُن کے یہ سخن
کی عرض "انتظار ہے شاہِ غیور کو
چلیے، پھپھی نے یاد کیا ہے حضور کو"

حضرت عباس کو منصب علم داری

عباس آئے ہاتھوں کو جوڑے حضورِ شاہ "جاؤ بہن کے پاس" یہ بولا وہ دیں پناہ
زینب وہیں علم لیے آئیں بہ عز و جاہ بولے، نشاں کو لے کے شہ عرش بارگاہ
ان کی خوشی وہ ہے، جو رضا پنجتن کی ہے
لو بھائی لو علم، یہ عنایت بہن کی ہے"

زینب بلائیں لے کے یہ کہتی تھیں بار بار
"منصب مبارک، اے شہِ مرداں کے یادگار!"
کہتے تھے ہاتھ جوڑ کے عباسِ ذی وقار
"مجھ کو سمجھیے عون و محمد کا جاں نثار
اُن کی طرف سے مہتمم بند و بست ہوں
مالک یہ شاہ زادے ہیں، میں پیش دست ہوں"

فرماتی تھیں یہ دخترِ خاتونِ کائنات
"دونوں کے تم بزرگ ہو، یہ کون سی ہے بات
اُس وقت ہے خوشی، جو اِس آفت سے ہو نجات
سمجھوں، کہ بے کسوں کو دوبارہ ملی حیات
گھیرا ہے بے گناہ شہِ مشرقین کو
تم سب شریک ہو کے بچا لو حسین کو"

دیتے تھے تہنیت جو عزیزانِ پُر جگر
عباس مسکرا کے جھکاتے تھے اپنا سر
فرطِ طرب سے چاند سا چہرہ تھا جلوہ گر
رُخ کی ضیا اِدھر تھی، علم کی چمک اُدھر
وہ آسماں حشم، تو یہ کیواں جناب ہیں
غُل تھا کہ ایک صبح میں دو آفتاب ہیں

خوش ہو کے آئی زوجۂ عباسِ نامور
شوہر کی سمت پہلے کنکھیوں سے کی نظر
لیں سبطِ مصطفےٰ کی بلائیں جھکا کے سر
زینب کے گرد پھر کے وہ بولی بچشمِ تر
"فیض آپ کا ہے اور تصدق امام کا
عزت بڑھی کنیز کی، رُتبہ غلام کا"

سر کو لگا کے چھاتی سے زینب نے یہ کہا
"تو اپنی مانگ کوکھ سے ٹھنڈی رہے سدا"
کی عرض "مجھ سی لاکھ کنیزیں ہوں، تو فدا
بانوئے نامور کو سہاگن رکھے خدا
بچے جئیں، ترقیِ اقبال و جاہ ہو
سائے میں آپ کے علی اکبر کا بیاہ ہو

"قسمت وطن میں خیر سے پھر شہ کو لے کے جائے — یثرب میں شور ہو کہ سفر سے حسین آئے
اُم البنین جاہ و حشم سے پسر کو پائے — جلدی شبِ عروسی کی خبر خدا دکھائے
مہندی تمھارا لال ملے ہاتھ پاؤں میں
لاؤ دُلھن کو بیاہ کے تاروں کی چھاؤں میں

ناگاہ آ کے بالی سکینہ نے یہ کہا — "کیسا ہے یہ ہجوم؟ کدھر ہیں مرے چچا؟
عہدہ علم کا اُن کو مُبارک کرے خدا — لوگو! مجھے بلاؤ تو لینے دو اک ذرا
شوکت خدا بڑھائے مرے عمو جان کی
میں بھی تو دیکھوں شان علی کے نشان کی"

بیٹوں کی آزردگی اور ماں کی برہم نمائی

سب خوش تھے خیمۂ شہِ ذی جاہ میں مگر — چیں بر جبیں تھے زینبِ ناشاد کے پسر
نہ جانبِ علم تھی، نہ ماں کی طرف نظر — آنکھوں میں ڈبڈبائے تھے آنسو جھکے تھے سر
اس طرح تھا عرق رُخِ پُر آب و تاب پر
جیسے پڑے ہوں قطرۂ شبنم گلاب پر

پھر کر اُدھر سے ماں نے جو بیٹوں پہ کی نظر — سمجھیں علم نہ ملنے سے بے دل ہیں یہ قمر
ہٹ کر کیا اشارہ کہ آؤ ذرا اِدھر — آئے عقب سے شہ کے، سعادت نشاں پسر
بولیں کہ "اب نہ ہوش نہ مجھ میں حواس ہیں
قرباں جاؤں کیا ہے جو چہرے اداس ہیں؟

"ہتھیار سج چکے ہیں شہنشاہِ حق شناس — تم نے نہ زیبِ جسم کیا فاخرہ لباس
مردوں کو جان دینے میں ہوتا نہیں ہراس — دولھا سے بن کے جاؤ امامِ اُمم کے پاس
کچھ ملگجے ہیں، آؤ میں کپڑے اُتار دوں
سُرمہ لگا دوں، گیسوئے مشکیں سنوار دوں

"شب سے تو صبح تک یہ دعا تھی ہر ایک پل — تیغوں میں پہلے ہم کو کرے سرخ رو اجل
اب کیا ہوا؟ یہ کون سا غصے کا ہے محل؟ — آنکھوں میں اشک، رخ پہ عرق، ابروؤں پہ بل
وہ خوش مزاجیاں، نہ وہ باتوں کے طور ہیں
اس وقت دیکھتی ہوں کہ تیور ہی اور ہیں

"ماں پر یہ آفتیں ہیں، یہ ماموں پہ ظلم و جور — پیارو! ہمارے حال پہ لازم ہے تم کو غور
نازک مزاجیوں کے کسی دن نہ تھے یہ طور — اب مشورے ہیں اور تصور ہیں اور اور
وہ دل نہیں، وہ آنکھ نہیں، وہ نظر نہیں
اوروں کا ذکر کیا، تمھیں میری خبر نہیں

"اس کا نہیں خیال کہ کیونکر جیے گی ماں — ہوتا ہے آفتوں میں محبت کا امتحاں
تم میری دس برس کی ریاضت ہو میری جاں! — مجھ سے سوا ہے کون تمھارا مزاج داں
جس پر یہ برہمی ہے وہ سب جانتی ہوں میں
غصے کی آنکھ کا ہے کو پہچانتی ہوں میں

"تو اپنے دودھ کی تمھیں دیتی ہوں میں قسم — اب کچھ کہو گے منہ سے، تو ہوگا مجھے بھی غم
سنتے تھے تم جو کہتے تھے عباسِ ذی حشم؟ — دو جا کے اُن کو تہنیتِ عہدۂ علم
صدقے گئی خلافِ ادب کچھ سخن نہ ہو
میری خوشی یہ ہے کہ جبیں پر شکن نہ ہو

"کنبے میں ایک نے بھی اگر سن لیا یہ حال — کہتی ہوں صاف صاف میں، مجھے ہوگا بہت ملال"
ننھے سے ہاتھ جوڑ کے بولے وہ نونہال — "ہم با وفا غلام ہیں، کیا تاب، کیا مجال
دیجیے سزا ہمیں، جو بل ابرو پہ پھر پڑیں
کہیے تو چھوٹے ماموں کے قدموں پہ گر پڑیں"

عباس علم دار کی شان

باہر تو اشتیاقِ علم میں ہے سب سپاہ　　خیمے میں باندھتے ہیں کمر شاہِ دیں پناہ
سب خویش و اقربا ہیں مسلح قریبِ شاہ　　ہیں سامنے علم لیے عباسِ عرش جاہ
رُتبے کو اوج، نخلِ ترقی مُراد پر
گویا علی کھڑے ہیں مہیا جہاد پر

شوکت میں رشکِ تاجِ سلیماں ہے خودِ سر　　کلغی ہمائے اوجِ سعادت کے جس میں پر
ماتھا ہے یا کہ ابر سے نکلا ہوا قمر　　ابرو ہیں ذوالفقار یداللہ نام ور
ڈورے جو سرخ سرخ ہیں چشمِ سیاہ میں
پھرتی ہیں خوں بھری ہوئی تیغیں نگاہ میں

ڈیوڑھی پہ خادماتِ محل کی ہوئی پکار　　"آتے ہیں اب حضور، خبردار، ہوشیار
خلعت پہن چکے ہیں علم دار نام دار　　نذریں خوشی کی دینے کو حاضر ہیں جاں نثار
بھائی بڑا ہے سر پہ، تو سایا ہے باپ کا
عہدہ جوان بیٹے نے پایا ہے باپ کا"

ہمراہیوں کی مسرت

یہ سُن کے شاد ہو گئی فوجِ حسین سب　　آئے رفیق سب درِ دولت پہ با ادب
بولے حبیب ابنِ مظاہر کہ "شکرِ رب　　ہاں سرفروشو! جنگ و جدل کا مزہ ہے اب
سر دے کے لے، بہشت کی جس کو تلاش ہو
دیکھیں علم کے سائے میں کس کس کی لاش ہو

"کون اور کائنات میں ہے دوسرا جواں　　قابل اسی کے دوشِ مبارک کے ہے نشاں
بازوئے شاہِ دیں، جگرِ مرتضےٰ کی جاں　　پیروں کا سرپرست، جوانوں کا قدرداں
باتیں پیمبروں کی خدا کے ولی میں تھیں
سب اس میں جمع ہیں صفتیں جو علی میں تھیں

"الفت وہی، حیا وہی، مہر و وفا وہی — طاعت وہی، وقار وہی، اتقا وہی
بخشش وہی، کرم وہی، جود و سخا وہی — جرأت وہی، جلال وہی، دبدبا وہی
گیتی میں اور بھی کوئی ایسا دلیر ہے؟
خود تھا علی کا قول کہ عباس شیر ہے،

"بے مثل سب ہیں قبلۂ عالم کے رشتہ دار — لیکن خدا نے اس کو دیا ہے عجب وقار
جیسے نبی کی فوج میں تھے شیر کردگار — ویسا ہی بے عدیل ہے یہ شہ کا جاں نثار
غازی بھی ہے، پناہ شہ بحر و بر بھی ہے
تلوار بھی حسین کی ہے اور سپر بھی ہے"

نکلا علم لیے ہوئے غازی بصد سرور — پنجے کا نور پھیل گیا رن میں دور دور
پردہ اٹھا، محل سے برآمد ہوئے حضور — پڑھنے لگے درود رفیقان ذی شعور
چوما ادب سے پائے امام انام کو
خم ہو گئے تمام نمازی سلام کو

علم کی شان

وہ شان اس علم کی، وہ عباس کا جلال — نخل زمردی کے تلے تھا علی کا لال
پرچم پہ جان دیتی تھیں، پریوں کا تھا یہ حال — غل تھا کہ دوش حور پہ بکھرے ہوئے ہیں بال
ہر لہر آب دار تھی کوثر کی موج سے
طوبیٰ بھی دب گیا تھا پھریرے کے اوج سے

تھا پنجتن کا نور جو پنجے میں جلوہ گر — آنکھوں کی پتلیوں میں بھی تھا روشنی کا گھر
ذرے نثار کرتے تھے اٹھ اٹھ کے اپنا زر — تکتے تھے فوق سے تو ملک، تحت سے بشر
اللہ رے چمک علم بوتراب کی
تار نظر بنی تھی کرن آفتاب کی

حسینی فوج کی میدانِ جنگ میں آمد

دیکھی جو شانِ حضرتِ عباس عرش جاہ — آگے بڑھی علم کے، پس از تہنیت سپاہ
خیمے سے آ رہی تھی صدا "وا محمداہ" — نشتر بہ دل تھی بنتِ علی کی فغان و آہ
رہ رہ کے اشک بہتے تھے روئے جناب سے
شبنم ٹپک رہی تھی گُلِ آفتاب سے

مولا چڑھے فرس پہ محمدؐ کی شان سے — ترکش لگایا ہرنے پہ کس آن بان سے
نکلا یہ جن و انس و ملک کی زبان سے — "اُترا ہی پھر زمیں پہ براق آسمان سے
سارا چلن خرام میں کبکِ دری کا ہی
گھونگھٹ نئی دُلھن کا ہی، چہرہ پری کا ہی

غصّے میں انکھڑیوں کے اُبلنے کو دیکھیے — بن بن کے، جھوم جھوم کے، چلنے کو دیکھیے
سانچے میں جوڑ بند کے ڈھلنے کو دیکھیے — تھم کر کنوتیوں کے بدلنے کو دیکھیے
گردن میں ڈالیں ہاتھ، یہ پریوں کو شوق ہی
بالا دوی میں اس کو ہما پر بھی فوق ہی"

جب چھیڑ کر فرس کو امامِ زماں بڑھے — آگے جو تھے رُکے ہوئے، وہ سب جواں بڑھے
کاندھے پہ رکھ کے نیزوں کو شیر ژیاں بڑھے — مشتاقِ تیغ و خنجر و تیر و سناں بڑھے
یوں طے کیا دلیروں نے اُس راہ خیر کو
جاتا ہی جس طرح کوئی گلشن میں سیر کو

تھم کر ہوا چلی، فرسِ خوش قدم بڑھا — جوں جوں وہ سوئے دشت بڑھا، اُدرم بڑھا
گھوڑوں کی لیں سواروں نے باگیں، علم بڑھا — رایت بڑھا کہ سروِ ریاضِ ارم بڑھا
پھولوں کو لے کے بادِ بہاری پہنچ گئی
بُستانِ کربلا میں سواری پہنچ گئی

اللہ ری سپاہِ خدا کی شکوہ و شان! جھکنے لگے جنودِ ضلالت کے بھی نشان
کمریں کسے علم کے تلے ہاشمی جوان دنیا کی زیب، دین کی عزت، جہاں کی جان
ایک ایک وُودمانِ علی کا چراغ تھا
جس کو بہشت پر تھا تفوّق، وہ باغ تھا

مجاہدوں کی تعریف حوروں کی زبان

غرفوں سے جھانک جھانک کے بولی ہر ایک حور "صلِّ علیٰ، علم کی چمک ہو کہ برقِ طور
یارب رہے نگاہِ بد اِس کی ضیا سے دُور پنجہ ہو یہ، کہ ایک جگہ پنجتن کا نور
جلوے ہیں سب محمد و حیدر کی شان کے
قربان اس جواں کے، نثار اس نشان کے

"آگے کبھی نہ دیکھی تھی اس حسن کی سپاہ دُنیا بھی خوبیوں کا مرقع ہے واہ واہ!
دیکھیں کسے کسے، کہ ہے ایک ایک رشکِ ماہ جاتی ہے جس کے رُخ پہ تو پھرتی نہیں نگاہ
دیکھو، انھیں دموں سے ہے رونق زمین کو
چُن کر حسین، لائے ہیں کس کس حسین کو

"شہرہ بہت تھا حُسن میں کنعاں کے ماہ کا قصہ سُنا ہوا ہے زلیخا کی چاہ کا
یاں آفتاب کو نہیں یارا نگاہ کا یوسف ہے ایک ایک جواں اس سپاہ کا
سنتے تھے ہم کہ عالمِ ایجاد زشت ہے
ایسے چمن کھلے ہیں، تو دُنیا بہشت ہے

"ہم شکلِ مصطفےٰ کا ہے کیا حسن، کیا جمال صُبحِ جبیں بھی اور شبِ گیسو بھی بے مثال
یہ لب، یہ خط، یہ چشم، یہ ابرو، یہ رُخ، یہ خال یاقوت و مشک و نرگس و نجم و مہ و ہلال
اک گل پہ یاں ہزار طرح کی بہار ہے
چہرہ نہ کہیے، قدرتِ پروردگار ہے

"لختِ دلِ حسن بھی ہی کس مرتبہ حسیں　　جس کے چراغِ حسن سے روشن ہی سب زمیں
یہ زلفِ مشک بیز، یہ آئینہ جبیں　　سرمایۂ خطا و ختن، کائناتِ چیں
رُخ کی بلائیں لیتی ہیں پریاں کھڑی ہوئی
سہرے کی ہر لڑی سے ہیں آنکھیں لڑی ہوئی

"نامِ خدا ہیں عون و محمد بھی کیا شکیل　　اِک مہرِ بے نظیر ہی، اِک بدرِ بے عدیل
افروختہ ہیں رخ، یہ شجاعت کی ہی دلیل　　ہمت بڑی ہی، گو کہ ہیں عمریں ابھی قلیل
مثلِ علی ہیں جنگ و جدل پر تلے ہوئے
دونوں کے نیمچوں کے ہیں ڈورے کھلے ہوئے

"عباسِ نامور بھی عجب سج کا ہی جوان　　نازاں ہی جس کے دوشِ منور پہ خود نشان
حمزہ کا رعب، صولتِ جعفر، علی کی شان　　ہاشم کا دل، حسین کا بازو، حسن کی جان
کیونکر نہ عشق ہو شہِ گردوں جناب کو
حاصل ہیں سیکڑوں شرف اس آفتاب کو

"اُس مہر کو تو دیکھو، یہ ذرّے ہیں جس کے سب!　　سرتاجِ آسمان و زمیں، نورِ عرشِ رب
ابرِ کرم، خدیوِ عجم، خسروِ عرب،　　عالی ہمم، امامِ اُمم، شاہِ تشنہ لب
جنباں زباں خشک ہی ذکرِ الٰہ میں
گویا کھڑے ہیں ختمِ رُسل رزم گاہ میں"

رُوزِ عاشورا

شاعرانہ تعلّی

نمکِ خوانِ تکلّم ہے فصاحت میری ناطقے بند ہیں سُن سُن کے بلاغت میری
رنگ اُڑتے ہیں وہ رنگیں ہے عبارت میری شور جس کا ہے وہ دریا ہے طبیعت میری
عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پُشت ہے شبیر کی مداحی میں

ایک قطرے کو جو دوں بسط تو قلزم کر دوں بحرِ مواج فصاحت کا تلاطم کر دوں
ماہ کو مہر کروں ذروں کو انجم کر دوں گنگ کو ماہرِ اندازِ تکلّم کر دوں
دردِ سر ہوتا ہے بے رنگ نہ فریاد کریں
بلبلیں مجھ سے گلستاں کا سبق یاد کریں

قلمِ فکر سے کھینچوں جو کسی بزم کا رنگ شمع تصویر پہ گرنے لگیں آ آ کے پتنگ
صاف حیرت زدہ مانی ہو تو بہزاد ہو دنگ خوں برستا نظر آئے جو دکھاؤں صفِ جنگ
رزم ایسی ہو کہ دل سب کے پھڑک جائیں ابھی
بجلیاں تیغوں کی آنکھوں میں چمک جائیں ابھی

وہ مرقع ہو کہ دیکھیں اُسے گر اہلِ شعور ہر ورق میں کہیں سایہ نظر آئے کہیں نور
غل ہو یہ ہے کششِ مو قلم طرّۂ حور صاف ہر رنگ سے ہو قدرتِ صانع کا ظہور
کوئی ناظر جو یہ نایاب نظیریں سمجھے
نقشِ ارژنگ کو کاواک لکیریں سمجھے

ماجرائے روزِ شہادت کا بیاں کرتا ہوں
رنج و اندوہ و مصیبت کا بیاں کرتا ہوں
تشنہ کاموں کی شجاعت کا بیاں کرتا ہوں
جاں نثاروں کی اطاعت کا بیاں کرتا ہوں

جن کا ہمتا نہیں، ایک ایک مصاحب ایسا
ایسے بندے نہ کبھی ہوں گے، نہ صاحب ایسا

مجاہدوں کی مدح

کیا جوانانِ خوش اطوار تھے سبحان اللہ!
کیا رفیقانِ وفادار تھے سبحان اللہ!
صفدر و غازی و جرار تھے سبحان اللہ!
زاہد و عابد و ابرار تھے سبحان اللہ!

زن و فرزند سے فرقت ہوئی مسکن چھوڑا
مگر احمد کے نواسے کا نہ دامن چھوڑا

اللہ اللہ عجب فوج، عجب غازی تھے!
عجب اسوار تھے بے مثل، عجب تازی تھے!
لائقِ مدح و سزاوارِ سرافرازی تھے!
گو بہت کم تھے، پہ آمادۂ جاں بازی تھے!

پیاس ایسی تھی، کہ آ آ گئی جاں ہونٹوں پر
صابر ایسے تھے کہ پھیری نہ زباں ہونٹوں پر

گو مصیبت میں، تلاطم میں، تباہی میں رہے
سر کٹے، پائوں مگر راہ الٰہی میں رہے
یوں سرفراز وہ سب لشکرِ شاہی میں رہے
جس طرح تیغِ دو دم دستِ سپاہی میں رہے

اس مصیبت میں نہ پایا کبھی شاکی ان کو
آبرو ساقیِ کوثر نے عطا کی اُن کو

شیر دل، منتخبِ دہر، وحید و ممتاز
موم فولاد ہو، آوازوں میں وہ سوز و گداز
اپنے معبود سے سجدوں میں عجب راز و نیاز
سر تو سجادوں پہ، اور عرشِ معلّٰی پہ نماز

زاہد ایسے تھے، کہ ممتاز تھے ابراروں میں
عابد ایسے تھے، کہ سجدے کیے تلواروں میں

زہد میں حضرتِ سلماں کے برابر کوئی — دولتِ فقر و قناعت میں ابوذر کوئی
صدق گفتار میں عمار کا ہمسر کوئی — حمزۂ عصر کوئی، مالکِ اشتر کوئی
ہوں گے ایسے ہی، محمدؐ کے جو شیدا ہوں گے
پھر جہاد ایسا نہ ہوگا، نہ وہ پیدا ہوں گے

وہ علم دار کہ جو شیرِ الٰہی کا خلف — گوہرِ بحرِ وفا، نیرِ دیں، دُرِّ نجف
فخرِ حمزہ سے فزوں کا، جعفر کا شرف — کس طرح چاند کہوں، چاند میں ہے عیبِ کلف
کس نے پایا وہ، جو تھا جاہ و حشم ان کے لیے
یہ علم کے لیے تھے، اور علم ان کے لیے

اک طرف اکبرِ مہ رو سا جوانِ نایاب — کچھ جو بچپن تھا، تو کچھ آمدِ ایامِ شباب
روشنی چہرے پہ ایسی کہ خجل ہو مہتاب — آنکھیں ایسی کہ رہا نرگسِ شہلا کو حجاب
جس نے اُن گیسوؤں میں رُخ کی ضیا کو دیکھا
شبِ معراج میں محبوبِ خدا کو دیکھا

اے خوشا حُسنِ رُخِ یوسفِ کنعانِ حسنؑ — راحتِ روحِ حسینؑ ابنِ علیؑ، جانِ حسنؑ
جسم میں زورِ علیؑ، طبع میں احسانِ حسنؑ — ہمہ تن خُلقِ حسنؑ، حُسنِ حسنؑ، شانِ حسنؑ
تن پہ کرتی تھی نزاکت سے گرانی پوشاک
کیا بھلی لگتی تھی بچپن میں شہانی پوشاک

اللہ اللہ اسدِ حق کے نواسوں کا جلال! — چاند سے چہروں پہ بل کھاتے ہوئے زلفوں کے بال
نیمچے کاندھوں پہ رکھے ہوئے مانندِ ہلال — گرچہ بچپن تھا، پہ رستم کو سمجھتے تھے وہ زال
صف سے گھوڑوں کو بڑھا کر جو پلٹ جاتے تھے
مورچے لشکرِ کفار کے ہٹ جاتے تھے

آستینوں کو چڑھائے ہوئے آمادۂ جنگ   وہی سارا اسد اللہ کا نقشہ، وہی ڈھنگ
سُرخ چہرے تھے، کہ شیروں کا یہی ہوتا ہے رنگ   ولولہ صف کے اُلٹنے کا، لڑائی کی اُمنگ

جسم پر تیر چلیں، نیزۂ خوں خوار چلے
شوق اس کا تھا، کہ جلدی کہیں تلوار چلے

یک بیک طبل بجا، فوج میں گرجے بادل   کوہ تھرّائے، زمیں ہل گئی، گونجا جنگل   طبلِ جنگ
پھول ڈھالوں کے چمکنے لگے، تلواروں کے پھل   مرنے والوں کو نظر آنے لگی شکلِ اجل

واں کے چاؤش بڑھانے لگے دل لشکر کا
فوجِ اسلام میں نعرہ ہوا "یا حیدر" کا

ہو گئے سُرخ شجاعت سے رُخِ آلِ نبی   آئی ٹھنڈی جو ہوا، بھول گئے تشنہ لبی
رن میں کڑکا ہوا، بجنے لگے باجے عربی   یکہ تازوں میں ہوا شورِ مبارز طلبی

اک گھٹا چھا گئی ڈھالوں سے سیہ کاروں کی
برق ہر صف میں چمکنے لگی تلواروں کی

برچھیاں تول کے ہر غول سے خوں خوار بڑھے   نیزے ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے اسوار بڑھے
تیر جوڑے ہوئے چلّوں میں کماں دار بڑھے   بولے شہ "یاں سے ابھی کوئی نہ زنہار بڑھے

اسدِ حق کے گھرانے کا یہ دستور نہیں
میں نبی زادہ ہوں، سبقت مجھے منظور نہیں"

یہ سُخن کہہ کے مخاطب ہوئے اعدا سے امام   "اے سپاہِ عرب و رُوم و رَے و کوفہ و شام
تم پہ کرتا ہے حسین آخری حجت کو تمام   بہ سرِ مصحفِ ناطق ہوں، سنو میرا کلام

سُخنِ حق کی طرف کانوں کو مصروف کرو
شور باجوں کا نامناسب ہے، تو موقوف کرو"

امام حسین کا فوج مخالف سے خطاب

یہ صدا سنتے ہی خود رُک گیا قرنا کا خروش
تھم گیا طبلِ وغا کی بھی وہ آواز کا جوش
ہو گیا جوڑ کے ہاتھوں کو جلاجل خاموش
کیا بجاتے، کہ بجا تھے نہ کسی شخص کے ہوش

چھیڑنا اُن کو سرودوں کا بھی ناساز ہوا
رُعبِ فرزندِ علی سُرمۂ آواز ہوا

کم ہوا غلغلۂ فوجِ ستم جب اک بار
یوں گہر بار ہوئے شہ کے لب گوہر بار
"صف کشی کس پہ ہے یہ اے سپہ نابنجار!
قتلِ سادات کی لشکر میں یہ کیسی ہے پکار؟

وطن آواروں پہ یہ قرق ہے کیوں پانی کا
کیا زمانے میں یہی طور ہے مہمانی کا؟

"مجھ کو لڑنا نہیں منظور، یہ کیا کرتے ہو؟
تیر جو چھوڑتے ہیں جو مجھ پر، تو خطا کرتے ہو
کیوں نبی زادے پہ غربت میں جفا کرتے ہو؟
دیکھو اچھا نہیں یہ ظلم، بُرا کرتے ہو

شمعِ ایماں ہوں اگر سر مرا کٹ جائے گا
یہ مرقع ابھی اک دم میں اُلٹ جائے گا

"میں ہوں سردارِ شبابِ چمنِ خُلدِ بریں
میں ہوں خالق کی قسم دوشِ محمد کا مکیں
میں ہوں انگشترِ پیغمبرِ خاتم کا نگیں
مجھ سے روشن ہے فلک، مجھ سے منور ہے زمیں

ابھی نظروں سے نہاں نور جو میرا ہو جائے
محفلِ عالمِ امکاں میں اندھیرا ہو جائے

"قلزمِ عزّت و شرف کا دُرِ شہوار ہوں میں
سب جہاں زیرِ نگیں ہے، وہ جہاں دار ہوں میں
آج گو مصلحتہً بے کس و ناچار ہوں میں
ورثۂ احمدِ مختار کا مختار ہوں میں

بخدا دولتِ ایماں اسی دربار میں ہے
سب بزرگوں کا تبرک مری سرکار میں ہے

"یہ قبا کس کی ہے بتلاؤ، یہ کس کی دستار؟ یہ زرہ کس کی ہے، پہنے ہوں جسے میں سینہ فگار؟
بر میں کس کا ہے یہ چار آئینہ؟ جوہر دار؟ کس کا رہوار ہے یہ، آج میں جس پر ہوں سوار؟
کس کا یہ خود ہے، یہ تیغ دو سر کس کی ہے؟
کس جری کی یہ کماں ہے، یہ سپر کس کی ہے؟

"تنگ آئے گا، تو رکنے کا نہیں پھر شبیر ایک حملے میں فنا ہوں گے یہ دولاکھ شریر
چل سکیں گے نہ تبر مجھ پہ، نہ تلوار، نہ تیر کاٹ جائے گی گلے سب کے یہ بُرّاں شمشیر
شیر ہوں، بخت دل غالب ہر غالب ہوں
میں جگر بند علی ابنِ ابی طالب ہوں

"مجھ کو ہوتا نہ اگر بخشش امت کا خیال، روک لیتا مجھے رستے میں، یہ تھی حُر کی مجال؟
تھام سکتا تھا لجام فرسِ برق مثال؟ پوچھ لو، دیکھا ہے اُس نے مرے شیروں کا جلال
گفتگو میں سر اُس کی جو نہ ہم ہو جاتے
ہاتھ اک وار میں پہنچوں سے قلم ہو جاتے

"گرچہ یہ امر نہیں اہلِ سخا کے شایاں کہ کسی شخص کو کچھ دے کے کرے سب پہ عیاں
پوچھ لو حُر تو ہے موجود، عیاں راچہ بیاں کس بیاباں میں مع فوج تھا یہ تشنہ دہاں
شور تھا آج چلیں جسم سے جانیں سب کی
منہ کے باہر نکل آئی تھیں زبانیں سب کی

"زیست ہر شے کی ہے پانی سے، شجر ہو کہ بشر مجھ سے دیکھا نہ گیا، میں تو سخی کا ہوں پسر
میں نے عباسِ دلاور سے کہا گھبرا کر مشکوں والے ہیں کہاں؟ اونٹ ہیں پانی کے کدھر؟
کرم ساقی کوثر کو دکھا دو بھائی
جتنا پانی ہے وہ پیاسوں کو پلا دو بھائی

"وہ نہ جانے کوئی گھوڑا، کوئی ناقہ بے آب — چھاگلیں جلد منگاؤ، مرا دل ہے بے تاب
سقّے مشکوں کے دہن کھول کے آ پہنچے شتاب — متوجہ ہوا میں خود کہ وہ تھا کارِ ثواب
چین آیا نہ مجھے بے انھیں آرام دیے
تھا جو اک جام کا پیاسا اُسے دو جام دیے

"تھی یہی فصل، یہی دھوپ، یہی گرم ہوا — ٹھنڈے پانی پہ گرے پڑتے تھے حُر کے رفقا
تشنہ کاموں کا یہ مجمع تھا، کہ ملتی نہ تھی جا — سقّے بھر بھر کے کٹوروں کو یہ دیتے تھے صدا
'بھائیو! آؤ، جو پانی کی طلب گاری ہے
چشمۂ فیضِ حسین ابن علی جاری ہے،'

"آبِ شبیر نکل جو دریا ہوا جنگل میں رواں — فرس و اُشتر و قاطر نہ رہے تشنہ دہاں
شکر کرنے لگی تر ہو کے ہر اک خشک زباں — پانی پی پی کے دعائیں مجھے دیتے تھے جواں
شور تھا، ابنِ یداللہ نے جاں بخشی کی
دین و دنیا کے شہنشاہ نے جاں بخشی کی

"ایک دن وہ تھا، اور اک دن یہ ہے اللہ اللہ! — کہ اُسی طرح ہمیں پیاس میں پانی کی ہے چاہ
چشمِ اُمید ہو گیا، سب نے پھرائی ہے نگاہ — کوئی اک جام بھی بھر کر ہمیں دیتا نہیں آہ
ہر مسلماں پہ نبی زادے کا حق ہوتا ہے
بچے روتے ہیں، تو سینہ مرا شق ہوتا ہے

"کئی معصوم ہیں کم سن، کہ موے جاتے ہیں — دم اُکھڑتا ہے مرا، جب انھیں غش آتے ہیں
پانی پانی جو وہ کہتے ہیں، تو شرماتے ہیں — پاس دریا ہے، پہ اک بوند نہیں پاتے ہیں
سب کو ایذا عوضِ آب و غذا ملتی ہے
دودھ صغر کو، نہ عابد کو دوا ملتی ہے"

حُر کا جہاد

امام کے خطبے کا اثر

شہ کی مظلومی پہ گریاں ہوئی ظالم کی سپاہ   عمر سعد نے کی مُڑ کے رُخِ حُر پہ نگاہ
بولا وہ "اشہد باللہ بجا کہتے ہیں شاہ   محسن و منعم و آقا ہیں مرا یہ ذی جاہ
ان کے احسان کا کیونکر کوئی منکر ہو جائے
سُخنِ حق میں جو شک لائے وہ کافر ہو جائے

حُر اور ابن سعد کی گفتگو

"ایک میں کیا ہوں، زمانے پہ ہے احساں ان کا   ابرِ رحمت ہیں، خطا پوش ہے داماں ان کا
خشک و تر پر ہے کرم خلق میں یکساں ان کا   اے خوشا حال، جو غربت میں ہو مہماں ان کا
جنتی ہے، جسے حاصل یہ شرف ہوئے گا
جو اُدھر ہوگا، خدا اس کی طرف ہوئے گا

"ان سے قطرہ کوئی مانگے، تو گہر دیتے ہیں   ہیں سخی ابن سخی، بات پہ سر دیتے ہیں
پیٹ سائل کا یہ فاقوں میں بھی بھر دیتے ہیں   یاں تو زر دیتے ہیں، فردوس میں گھر دیتے ہیں
آس مجرم کی، گنہ گار کی امید ہیں یہ
ذرّہ پرور جنھیں کہتے ہیں، وہ خورشید ہیں یہ

"یہ ابھی ہاتھ اُٹھا کر جو دعا فرمائیں   جتنے عالم کے گنہ گار ہیں، بخشے جائیں
حق سے جس شے کے طلب گار ہوں، فوراً پائیں   جامِ کوثر ہمیں فردوس سے حوریں لائیں
مثلِ خورشید ہے روشن، وہ شرف ان کا ہے
یہ وہ بندے ہیں، کہ اللہ بہ حق جن کا ہے"

حُر سے گھبرا کے یہ بولا عمرِ سعد شریر
"یہ تو ہے صاف طرف داریِ شہ کی تقریر
اپنے حاکم کا نہ کچھ ذکر، نہ تعریفِ امیر
اللہ اللہ یہ اوصاف، یہ مدحِ شبیر!
سُن چکا ہوں میں کہ مضطر ہے کئی راتوں سے
اُلفتِ شاہ ٹپکتی ہے تری باتوں سے

"نہ وہ آنکھیں، نہ وہ چتون، نہ وہ تیور، نہ مزاج
سیدھی باتوں میں بگڑنا، یہ نیا طور ہے آج
تخت بخشا ہے محمدؐ کے نواسے نے، کہ تاج؟
جن کو سمجھا ہے غنی دل میں، وہ خود ہیں محتاج
کون سا باغ تجھے شاہ نے دکھلایا ہے
کہیں کوثر کے تو چھینٹوں میں نہیں آیا ہے؟

"میں جہاں دیدہ ہوں، سب مجھ کو خبر ہے تیری
قرۃ العین محمدؐ پہ نظر ہے تیری
ہونٹ بھی خشک ہیں، اور چشم بھی تر ہے تیری
جسم خالی ہے اِدھر، جان اُدھر ہے تیری
راہ میں کچھ جو سلوک اور نوازش کی ہے
تو نے فرزندِ یداللہ سے سازش کی ہے

"خیر مخفی نہ رہے گا یہ قصور اور فتور
لکھیں گے عہدۂ اخبار پہ جو ہیں مامور
حاکمِ شام ہے جابر، وہ سزا دے گا ضرور
گر تجھے دار پہ کھینچے، تو کچھ اس سے نہیں دور
سب تری قوم کے سر تن سے جدا ہوئیں گے
زن و فرزند گرفتارِ بلا ہوئیں گے

"خوف کس بات کا، پیاسوں سے یہ تھرانا کیا
لب پہ ہر مرتبہ بے کس کی ثنا لانا کیا
ننگ کی بات ہے، دشمن کی طرف جانا کیا
ہو نبی یا کہ وصی، جنگ میں شرمانا کیا
ابھی لے جائیں جو شبیر کا سر ہاتھ لگے
خلد ہم اس کو سمجھتے ہیں کہ زر ہاتھ لگے"

پکارا کہ زباں بند کر او ناہموار ! قابلِ لعن ہے تو، اور وہ تیرا سردار
ابنِ زہرا ہے جگر بند رسولِ مختار میرا کیا مُنہ، جو کروں مدح امامِ ابرار
اِک زمانہ صفتِ آلِ عبا کرتا ہے
آپ قرآں میں خدا ان کی ثنا کرتا ہے

"عزتِ دیں، شرفِ کون و مکاں ہیں شبیر جانِ زہرا ہیں، محمد کی زباں ہیں شبیر
سنگ پانی ہو، وہ اعجاز بیاں ہیں شبیر جان کیوں ہو نہ اُدھر، جانِ جہاں ہیں شبیر
مہرباں ہوں، تو ابھی عقدہ کشائی ہو جائے
وہ نہ بخشیں، تو خدا تک نہ رسائی ہو جائے

"کیا میں، اور کیا وہ ریاست مری کیا میرے عیال جب کہ آفت میں پھنسے احمدِ مختار کی آل
واں کی املاک و زراعت کا ہو کیا مجھ کو خیال یاں ہوئی جاتی ہے سادات کی کھیتی پامال
گھر کا اب دھیان نہ بچوں کا الم ہے مجھ کو
خانہ بربادیِ شبیر کا غم ہے مجھ کو

"عقلِ خیرہ سے بہکا نہ مجھے او ابلیس ! یہی کونین کا مالک ہے، یہی راس و رئیس
کیا مجھے دے گا ترا حاکمِ ملعون و خسیس کچھ تردد نہیں، کہہ دے کہ لکھیں پرچہ نویس
ہاں، سوئے ابنِ شہنشاہِ عرب جاتا ہوں
لے ستمگر، جو نہ جاتا تھا، تو اب جاتا ہوں"

کہہ کے یہ ڈاب سے غازی نے نکالی تلوار سُرخ آنکھیں ہوئیں، ابرو پہ بل آئے اک بار
تن کے دیکھا طرفِ فوجِ امامِ ابرار پاؤں رکھنے لگا بن بن کے زمیں پر رہوار
غل ہوا سیدِ والا کا ولی جاتا ہے
لو طرف دارِ حسین ابنِ علی جاتا ہے"

حُر کی حضرتِ امام میں حاضری اور عفوِ قصور

سُن کے یہ بانگ جو بی، اسپِ سُبک تاز اُڑا ڈر سے رنگِ عمرِ شعبدہ پرواز اُڑا
کیا اُڑا رخش، کہ طاؤس بصد ناز اُڑا دی پرندوں نے یہ آواز کہ شہباز اُڑا
باغِ زہرا میں نسیمِ سحری جاتی ہے
غُل تھا، دربارِ سلیماں میں پری جاتی ہے

کیا دو تین رسالوں نے تعاقب ہر چند حُر کا ہاتھ آنا تو کیسا، نہ ملی گردِ سمند
کہتے تھے شرم سے وہ لے کے جو دوڑے تھے کمند یہ چھلاوا تھا کہ آندھی، یہ فرس تھا کہ پرند
کیا سُبک سوئے چمن بادِ بہاری پہنچی
ہم یہیں رہ گئے، واں حُر کی سواری پہنچی

آمدِ حُر کی خبر سے ہوئے آگاہ جو شاہ ہنس کے عباس سے فرمایا کہ "اے غیرتِ ماہ!
میرے لشکر کی طرف ہے رخِ حُرِّ ذی جاہ سب سے کہہ دو کہ نہ روکے کوئی اس شخص کی راہ
جاؤ لینے کو عجب رُتبہ شناس آتا ہے
میرا مہماں، مرا عاشق، مرے پاس آتا ہے"

ذکر یہ تھا، کہ صدا دُور سے آئی اک بار "الغیاث اے جگر و جانِ رسولِ مختار!
مجرم ایسا ہوں کہ عصیاں کا نہیں جس کے شمار عفو کر، عفو کر، اے چشمۂ فیضِ غفار!
پار دریائے خطا سے مری کشتی ہو جائے
دوزخی بھی ترے صدقے میں بہشتی ہو جائے

کئی روز سے تلاطم میں ہوں اے شاہنشاہ! مدد اے نوحِ غریباں! مرا بیڑا ہے تباہ
دست و پا گم ہیں کچھ ایسے کہ نہیں سوجھتی راہ شور کرتا ہوں کہ بتلائے کوئی جائے پناہ
ابرِ رحمت کی طرف جا، یہ صدا دیتے ہیں
سب ترے دامنِ دولت کا پتا دیتے ہیں

"تیرے دامن کے نثار اے مرے آقائے جلیل! رحم کر، رحم، کہ شرمندہ ہے یہ عبدِ ذلیل
دل خنک ہوئے، جو نکلے کوئی کوثر کی سبیل جان آجائے، جو مولائے دو عالم ہوں کفیل
نہ وزیروں میں یہ ہمت، نہ شہنشاہ میں ہے
سب کے درد کا درماں تری درگاہ میں ہے

"خلق میں آپ کے والد کا کرم ہے مشہور بات میں بخش دیے سیکڑوں بندوں کے قصور
مجھ سے ہیں باگ پکڑ لینے پہ آزردہ حضور بخش دیجے، تو کرم سے نہیں کچھ آپ کے دور
یہ تو کیونکر کہوں میں لائق تعزیر نہیں
مگر اسود سے زیادہ مری تقصیر نہیں

"اے مددگارِ مسکین ضعفا! ادرکنی اے خبر گیرِ گروہِ غربا! ادرکنی
پاؤں لغزش میں ہیں اے دستِ خدا! ادرکنی ہاتھ باندھے ہوئے ہیں اے عقدہ کشا! ادرکنی
دیجیے حر کو سند نار سے آزادی کی
آئیے، جلد خبر لیجیے فریادی کی"

استغاثہ یہ کیا حر نے جو با دیدۂ نم آگیا جوش میں اللہ کا دریائے کرم
خود بڑھے ہاتھوں کو پھیلائے شہنشاہِ امم حر کو یہ ہاتفِ غیبی نے صدا دی اس دم
شکر کر سبطِ رسول ثقلین آتے ہیں
لے بہادر! ترے لینے کو حسین آتے ہیں

حر نے دیکھا کہ چلے آتے ہیں پیدل شبیر دوڑ کر چوم لیے پائے شہِ عرش سریر
شہ نے چھاتی سے لگا کر کہا "اے باتوقیر! میں نے بخشی، مرے اللہ نے بخشی تقصیر
جرم سب محو کیے حق نے ترے دفتر سے
آج پیدا ہوا گویا شکمِ مادر سے"

حر پکارا "بابی انت و امی یا شاہ! — قابلِ عفو نہ تھے بندۂ آثم کے گناہ
مجھ سے گمراہ کو اک آن میں مل جائے پناہ — سب ہے صدقہ انھیں قدموں کا، خدا ہے آگاہ
مہر ذرّے پہ جو ہو، نیّرِ تاباں ہو جائے
آپ جس مور کو چاہیں، وہ سلیماں ہو جائے"

ساتھ لے کر حرِ غازی کو چلے شاہِ امم — ہاتھ میں ہاتھ تھا مہماں کا، اللہ رے کرم!
راس و چپ قاسم و اکبر تھے، زہے جاہ و حشم — سر پہ کھولے ہوئے تھے حضرتِ عباسؑ علم
دور سے اہلِ خطا تیر جو برساتے تھے
رفقا سائے میں ڈھالوں کے لیے آتے تھے

لائے اس عزت و حرمت سے جو مہماں کو امام — بولے عباسؑ "کمر کھول اب اے نیک انجام!"
شہ نے فرمایا "مناسب ہے کوئی دم آرام" — عرض کی حُر نے "کمر خلد میں کھولے گا غلام
فاتحہ پڑھ کے یہ شمشیر و سپر باندھی ہے
آج اس عزم پہ خادم نے کمر باندھی ہے

ہے بہت شمر و عمر سے مجھے لڑنے کی امنگ — ایک ہی وار میں دونوں کو کروں گا چورنگ
لشکرِ شام سے پیہم چلے آتے ہیں خدنگ — شاہزادوں کی سپر ہوں کہ عبادت ہے یہ جنگ
کہیں ایسا نہ ہو، بچہ کوئی بے جاں ہو جائے
پہلے یہ تازہ غلام آپ پہ قرباں ہو جائے"

شہ نے فرمایا کہ "دشوار ہے فرقت تیری — مجھ کو مر کر بھی نہ بھولے گی رفاقت تیری
وادریغا! ہوئی کچھ ہم سے نہ خدمت تیری — کر سکے آہ! نہ اک وقت بھی دعوت تیری
سچ ہے غربت کی عجب شام و سحر ہوتی ہے
تیسرا دن ہے کہ فاقوں میں بسر ہوتی ہے"

حُر نے رو کر سرِ تسلیم جھکایا بہ ادب — شہ نے رومال رکھا آنکھوں پہ رونے لگے سب
جب چڑھا گھوڑے پہ وہ عاشقِ سلطانِ عرب — شاہ بولے کہ "عجب دوست چھٹا ہائے غضب"
خیمے سے جانبِ میداں جو ہوا آتی تھی
گریۂ آلِ محمدؐ کی صدا آتی تھی

حُر چلا فوجِ مخالف پہ اُڑا کر توسن — چوکڑی بھول گئے جس کی تگاپو سے ہرن — آمد
وہ جلال اور وہ شوکت، وہ غضب کی چتون — ہاتھ میں تیغ، کماں دوش پہ، بر میں جوشن
وہ بکھرے دوش پہ شعلے کے جو بل کھاتے تھے
کاکلِ حور کے سب پیچ کھلے جاتے تھے

زورِ بازو کا نمایاں تھا بھرے شانوں سے — دستِ فولاد دبا جاتا تھا دستانوں سے
برچھیوں اُڑتا تھا دب کے فرس رانوں سے — آنکھ لڑ جاتی تھی دریا کے نگہبانوں سے
خودِ رومی کی جو ضو تا بہ فلک جاتی تھی
چشمِ خورشید میں بجلی سی چمک جاتی تھی

نیزۂ حر کی سناں پر نہ ٹھہرتی تھی نگاہ — تھا یہ ظاہر کہ نکالے ہو زباں مارِ سیاہ
قبضۂ تیغ پہ رکھے تھی سپر عجز پناہ — آفتابی وہ سپر جس سے خجل گردۂ ماہ
قدر اندازوں کو جانوں کے ادھر لالے تھے
تیر ترکش میں نہ تھے آگ کے پرکالے تھے

آنے جانے کا بہادر کے کروں کیا مذکور — پہلے کچھ اور ہی جلوہ تھا، پر اب اور ظہور
اے خوشا رتبہ، فیضِ قدمِ پاک حضور! — غل تھا آتا ہے ملک پہنے ہوئے خلعتِ نور
صحبتِ اہلِ ولا دل کو جلا کرتی ہے
مس کو اک آن میں اکسیر طلا کرتی ہے

واہ کیا فیض ہے سرکارِ شہ عالم میں ذرۂ خاک کو خورشید کیا اک دم میں
نور یہ حور میں دیکھا، نہ بنی آدم میں یہ وہی خیر جری ہے جو ابھی تھا ہم میں

تن ہے خوش بو، رُخِ گُل رنگ تر و تازہ ہے
خاکِ نعلینِ مبارک کی عجب غازہ ہے

ہر ذرہ ہے جہاں، چہرۂ روشن ایسا چاند بھی جس سے کرے کسبِ ضیا، تن ایسا
حمزہ ہو بازوے داؤد کا، جوشن ایسا ہوش پریوں کے اُڑے جاتے ہیں، توسن ایسا

گلشنِ دہر میں لو بادِ بہاری آئی
قاف میں غل ہے سلیماں کی سواری آئی

حر پکارا کہ "بجا کہتے ہو، بے شک، لاریب دامنِ حضرتِ شبیر نے ڈھانپے مرے عیب
دولتِ دیں سے نہ دامن مرا خالی ہے نہ جیب بارک اللہ کی دیتا ہے صدا ہاتفِ غیب

فیض پا کر پے شمشیر زنی آیا ہوں
یاں سے محتاج گیا، واں سے غنی آیا ہوں

"مجھ کو خورشید کیا نورِ خدا کی ضو نے نور بخشا قمرِ فاطمہ کے پرتو نے
بخت پائے ہیں سکندر کے غلام تو نے گنج وہ لایا ہوں دیکھا جو نہ تھا خسرو نے

دور دورہ آج سے میرا ہے، زمانہ میرا
کبھی خالی نہیں ہونے کا خزانہ میرا

"رُخِ روشن کو مرے تکتے ہو کیا حسرت سے مل کے آیا ہوں منھ اپنا قدمِ حضرت سے
نور وہ ہے جسے دیکھیں نظرِ رغبت سے واے وہ لوگ جو محروم ہیں اس دولت سے

مجھ کو بھی دیکھ کے بیدار نہیں ہوتے ہو
ہے غضب آنکھیں تو کھولے ہو مگر سوتے ہو

"جانِ سلطانِ رسالت کو غنیمت جانو پسرِ شاہِ ولایت کو غنیمت جانو
قمرِ برجِ امامت کو غنیمت جانو نورِ خالق کی زیارت کو غنیمت جانو
ساتھ اس کے برکت خلق سے اُٹھ جائے گی
پھر جو ڈھونڈھوگے یہ دولت تو نہ ہاتھ آئے گی"

یہ سُخن سُن کے پکارا پسرِ سعدِ شریر "ہاں اُڑ فدا شہ دیں پہ چلیں نیزہ و تیر" جنگ
لیے حربوں کو بڑھا فوج کا انبوہِ کثیر فاتحہ پڑھ کے جواں مرد نے کھینچی شمشیر
حُر کا مُنھ سُرخ ہوا، فوجِ ستم زرد ہوئی
شعلۂ تیغ سے بجلی کی چمک گرد ہوئی

زلزلہ آگیا، نعرے جو سُنے ضیغم کے استخواں کانپ گئے زیر زمیں رستم کے
تہ و بالا ہوئیں لشکر کی صفیں جم جم کے برقِ شمشیر سے ڈر ڈر کے فرس بھی چمکے
نوبتِ جنگ نہ آئی تھی کہ دل ٹوٹ گئے
برچھیاں گر گئیں ہاتھوں سے، نشاں چھوٹ گئے

چھیڑ کر باگ فرس کو جو ذرا گرمایا غیظ میں آن کے گھوڑا بھی غضب کف لایا
شیر سا فوجِ مخالف پہ جھپٹ کر آیا روند ڈالا اُسے دم میں، جسے سرکش پایا
اُس کا قاتل تھا، جو دشمن شہِ عالی کا تھا
کاٹ ہر نعل میں شمشیرِ ہلالی کا تھا

حشر برپا تھا، کہ تیغ حرِ ذی جاہ چلی آگ برسانے کو بجلی سوئے جنگاہ چلی
کس کرشمے سے وہ لیلیٰ ظفر راہ چلی گہ تھمی گاہ بڑھی، گاہ رکی گاہ چلی
زخم سینوں کے گریباں کی طرح پھٹتے تھے
چال کیا تھی کہ ہزاروں کے گلے کٹتے تھے

دھار ایسی کہ رواں ہوتا ہو دھارا جیسے
گھاٹ وہ گھاٹ کہ دریا کا کنارا جیسے
چمک ایسی کہ حسینوں کا اشارا جیسے
روشنی وہ کہ گرے ٹوٹ کے تارا جیسے
کوندنا برق کا شمشیر کی ضو میں دیکھا
کبھی ایسا تو نہ چم خم مہ نو میں دیکھا

آئی جس غول پہ، لاشوں سے زمیں پٹ گئی
دست و پا، صدر و کمر، گردن و سر کاٹ گئی
چاٹ ایسی تھی لہو کی، کہ صفیں چاٹ گئی
دیکھی تیغوں کی جدھر باڑھ اسی گھاٹ گئی
جس پہ جاتی تھی، نہ بے جان لیے پھرتی تھی
ایک بجلی تھی، مگر لاکھ جگہ گرتی تھی

کیں صفیں صاف، مگر منہ کی صفائی نہ گئی
کج ادائی کو نہ چھوڑا، وہ لڑائی نہ گئی
کاٹ چھانٹ، اور وہ لگاوٹ وہ دکھائی نہ گئی
سیکڑوں خون کیے، اور کہیں آئی، نہ گئی
شور تھا برق پئے جلوہ گری نکلی ہے
جان لینے کو اجل بن کے پری نکلی ہے

جنگ میں تیغ کو دعوی تھا کہ یکتا میں ہوں
سر اٹھایا تھا یہ گھوڑے نے کہ عنقا میں ہوں
چرخ کہتا تھا کہ یارب تہ و بالا میں ہوں
برق کہتی تھی کہ تلوار ہے یہ، یا میں ہوں
سحر میں ہے یہ، جو تڑپ پر فلک میری ہے؟
تیغ کرتی تھی اشارہ یہ چمک میری ہے

نہ تھمی سنگ سے وہ، اور نہ رکی آہن سے
ہاتھ اڑائے گئی پہنچوں سے، تو سر گردن سے
نہ تھمی اس کی گرمی ضرب کسی جوشن سے
چل گئی باد مخالف جدھر آئی سن سے
جوش طوفاں کا دکھا کر وہ خوش اسلوب گئی
خوں کے دریا میں ہر اک کشتی تن ڈوب گئی

کثرتِ جوہرِ ذاتی سے وہ گو جال میں تھی — پر تڑپ صورتِ ماہی وہی ہر حال میں تھی
تھی چمک جانے میں بجلی، تو پری چال میں تھی — کبھی مغفر میں، کبھی سر میں، کبھی ڈھال میں تھی
کہیں دم لینے کی مہلت نہ تھی بسمل کے لیے
تھی جگر کے لیے برچھی، تو چھری دل کے لیے

خم وہ پایا تھا کہ شرمائے ہلالِ مہِ عید — حر کے ہاتھ آگئی تھی گلشنِ جنت کی کلید
برش ایسی تھی کہ کٹ کٹ گئی سب فوجِ یزید — جامۂ کفر کے پُرزے تھے، زہے قطع و برید!
نہ بچا تارِ نفس خلق میں جینے کے لیے
چاک زخموں کے فقط رہ گئے سینے کے لیے

آب نے آتشِ سوزاں کا اثر دکھلایا — تاب نے مرگِ مفاجات کا گھر دکھلایا
باڑھ نے جادۂ صحرائے سقر دکھلایا — گھاٹ نے آئینۂ فتح و ظفر دکھلایا
تیغ کہتی تھی، درِ فتح کی مفتاح ہوں میں
قول قبضے کا یہ تھا، قابضِ ارواح ہوں میں

کئی چلے کیے ہیم جو کماں داروں پر — چل گئے تیر ملامت کے خطاکاروں پر
چٹکیاں سب کی دھری رہ گئیں سوفاروں پر — رُخ پھرا تھا کہ گری برق ستمگاروں پر
جل کے خرمن ہوا یوں خاک، کہ خوشہ نہ ملا
کشمکش میں کہیں چھپنے کو بھی گوشہ نہ ملا

الفِ گرز کو کر دیتی تھی ہر ضرب میں دال — تھی نئی آمد و رفت اور نئی طرح کی چال
کہیں برچھی کی انی تھی، تو کہیں تیر کی بھال — کہیں تلوار، کہیں خنجرِ براں، کہیں ڈھال
ضرب کو روک کے دشمن کو فنا کرتی تھی
دم بدم فوجِ ستمگر بھی ثنا کرتی تھی

شور تھا، آگ ہے تلوار میں یا پانی ہے — تھل بھی کشتیِ تن، خون میں طوفانی ہے
ضرب میں فرد ہے، یہ زور میں لاثانی ہے — کہتا تھا حُر، "یہ فقط قوتِ ایمانی ہے"

زور تھا جم میں نہ ایسا، نہ وغا کی طاقت
سب ہے یہ سبطِ پیمبر کی دعا کی طاقت

کہہ گئے یہ فوج میں، پھر تشنہ جگر ڈوب گیا — ورطۂ قلزمِ آفت میں گُہر ڈوب گیا
لشکرِ شام کے بادل میں قمر ڈوب گیا — کشمکش تھی کہ عرق میں گُلِ تر ڈوب گیا

تھا کبھی شیر سا بپھرا ہوا شمشیروں میں
کبھی نیزوں کے نیستاں میں، کبھی تیروں میں

گہ چھپا اور کبھی نکلا، وہ مہِ برجِ شرف — کبھی اِس صف میں در آیا، کبھی ڈھونڈی وہ صف
کبھی دریا کے کنارے، کبھی صحرا کی طرف — کبھی نعرہ تھا کہ صدقے ترے یا شاہِ نجف!

جتنے مجروح تھے دم اُن کے نکل جاتے تھے
شیر بھی نام علی سُن کے دہل جاتے تھے

نخل تھراتے تھے سب، گونج رہا تھا جنگل — سر کی جاتی تھی زمیں اُن کی، غضب تھی ہلچل
کوند جاتی تھی سروں پر جو وہ شمشیرِ اجل — منہ کے بل گرتا تھا کوئی، تو کوئی سر کے بل

حشر برپا تھا، سواروں پہ فرس لوٹتے تھے
زد پہ چار، ایک پہ دو، پانچ پہ دس لوٹتے تھے

بڑھ کے فرماتے تھے عباس "تیرے ہمت جاہ" — "بارک اللہ" کی دیتا تھا صدا دلبرِ شاہ
کہتے تھے ابنِ حسن "واہ عمو غازی واہ" — شاہ ہر ضرب پہ فرماتے تھے "ماشاءاللہ"

اپنی جانبازی کا غازی جو صلہ پاتا تھا
مسکراتا ہوا تسلیم کو جھک جاتا تھا

شہادتِ حُر

جب جھکنے میں لعینوں نے جو فرصت پائی ۔۔۔ سامنا چھوڑ کے سب فوج عقب سے آئی
لاکھ خوں ریز اُدھر اور ادھر تنہائی ۔۔۔ باگ گھوڑے کی پھراتا تھا کہ برچھی کھائی
آگیا موت کے پنجے میں نہ کچھ دیر لگی
فرق پر گرز لگا، دوش پہ شمشیر لگی

سینہ غربال ہوا، تیر چلے اعدا کے ۔۔۔ رکھ دیا شیر نے قربوس پہ سر نہوڑا کے
علی اکبر نے یہ حضرت سے کہا چلّا کے ۔۔۔ "گر ہو ارشاد، تو بھائی کو سنبھالوں جا کے
خانہ زیں سے عدم کا سفری گرتا ہے
خاک پہ گھوڑے سے اب حُر جری گرتا ہے"

عرض کی حضرت عبّاس نے "جاتا ہے غلام" ۔۔۔ جوشِ رقت میں کہا شہ نے "نہیں اے گل فام!
میری الفت میں ہوا قتل حُرِ نیک انجام ۔۔۔ دوست کیسے جو بُرے وقت میں ہم آئیں نہ کام
اُس پہ جب سخت گھڑی ہوگی تو کام آئیں گے
لاش کیا، قبر میں بھائی کی ہم جائیں گے"

یہ سخن کہہ کے چلے رن کو جنابِ شبیر ۔۔۔ واں گرا خاک پہ گھوڑے سے حُرِ باتوقیر
دیکھ کر شاہ کو آتے ہوئے بھاگے بے پیر ۔۔۔ پہنچے لاشے پہ امامِ دو جہاں وقتِ اخیر
چمنِ ہستی بھائی کو اُجڑتے دیکھا
ایڑیاں خاک پہ زخمی کو رگڑتے دیکھا

حُر کو چونکا کے حبیب ابن مظاہر نے کہا ۔۔۔ "شاہ بے تاب ہیں اے حُرِ جری ہوش میں آ
دیکھ دیدارِ جگر بندِ جنابِ زہرا ۔۔۔ کوچ درپیش ہے یہ وقت نہیں غفلت کا
دم رُکا ہے تو اشارے سے وصیت کرلے
نزع میں نورِ الٰہی کی زیارت کرلے

"کسی آقا نے کبھی کی ہے یہ توقیرِ غلام؟ — دیکھ تو رحم، ترے واسطے روتے ہیں امام
بھائی فرماتے ہیں شفقت سے شہِ عرش مقام — اے خوشا حال! خدا سب کا کرے نیک انجام
حشر تک خلق میں یہ ذکرِ غم انگیز رہا
تو تو بچپن کے غلاموں سے بھی کچھ تیز رہا"

نیم وا چشم سے حُر نے رُخِ مولا دیکھا — زیرِ سر زانوئے شبیر کا تکیہ دیکھا
مسکرا کر طرفِ عالمِ بالا دیکھا — شہ نے فرمایا کہ "اے حُرِ جری کیا دیکھا؟"
عرض کی حسنِ رُخِ حور نظر آتا ہے
فرش سے عرش تلک نور نظر آتا ہے

"قبلہ رو کیجیے لاشہ مرا اے قبلۂ دیں! — پڑھیے یٰسین کہ اب ہے یہ دمِ باز پسیں
کوچ نزدیک ہے، اے بادشہِ عرش نشیں! — لیجیے، تن سے نکلتی ہے مری جانِ حزیں
بات بھی اب تو زباں سے نہیں کی جاتی ہے
کچھ اُڑھا دیجیے مولا، مجھے نیند آتی ہے"

کہہ کے یہ گود میں شبیر کی لی انگڑائی — آیا ماتھے پہ عرق، چہرے پہ زردی چھائی
شہ نے فرمایا "ہمیں چھوڑ چلے کیوں بھائی" — چل بسا حُرِ جری، پھر نہ کچھ آواز آئی
طائرِ روح نے پرواز کی طوبیٰ کی طرف
پتلیاں رہ گئیں پھر کر شہِ والا کی طرف

حُر کی مدح

بخدا فارسِ میدانِ تہوّر تھا حُر — ایک، دو لاکھ سواروں میں بہادر تھا حُر
نام و رُخ سے ابوذر کی طرح حُر تھا حُر — گوہرِ تاجِ سرِ عرش ہو، وہ دُر تھا حُر
ڈھونڈھ لی راہِ خدا کام بھی کیا نیک ہوا
پاک طینت تھی، تو انجام بھی کیا نیک ہوا

نار سے نور کی جانب اُسے لائی تقدیر — ابھی ذرہ تھا، ابھی ہو گیا خورشید منیر
شافعِ حشر نے خوش ہو کے بحل کی تقصیر — تکیۂ زانوئے شبیر ملا وقتِ اخیر
اوج و اقبال و حشم فوجِ خدا میں پایا
جب ہوا خاک، تو گھر خاکِ شفا میں پایا

آیا کس شان سے کعبے کی طرف چھوڑ کے دیر — کوئی حضرت کا یگانہ بھی نہ سمجھا اسے غیر
حق نے لکھ دی تھی جو تقدیر میں فردوس کی سیر — فتنہ و شر سے بچا، ہو گیا انجام بخیر
ذکرِ خیر اس کے مجھے پر بھی ہوے جاتے ہیں
عملِ نیک ہر اک وقت میں کام آتے ہیں

کیوں نہ بالیدہ ہو اس کا چمنِ جاہ و جلال — جس کو سرسبز کرے خود اسد اللہ کا لال
ہو گیا فاطمہ کے باغ میں آتے ہی نہال — وہ ثمر پائے کہ پہنچے نہ جہاں دستِ خیال
کھل گیا غنچۂ دل، عذر جو منظور ہوئے
صورتِ برگِ خزاں دیدہ گنہ دور ہوئے

واہ رے طالعِ بیدار! زہے عزت و جاہ! — حُر پہ کیا فضلِ خدا ہو گیا اللہ اللہ!
پیشوائی کو گئے آپ شہِ عرش پناہ — خضرِ قسمت نے بتا دی اُسے فردوس کی راہ
خلد تو دور ہے جدّہ قریب ایسا ہو
بخت ایسے ہوں، اگر ہو تو نصیب ایسا ہو

انصار کا جہاد

اَے شمعِ قلم! روشنیِ طور دکھا دے
اے لوح! تجلّیِ رُخِ حور دکھا دے
اَے بحرِ طبیعت! گہرِ نور دکھا دے
اَے شاہدِ معنی! رُخِ مستور دکھا دے
پُرنور مضامین کی وہ جلوہ گری ہو
خورشید جہاں تاب چراغِ سحری ہو

اَے طبعِ رسا! خلد کا گلزار دکھا دے
اَے باغِ سخن! گلشنِ بے خار دکھا دے
اَے شمعِ زباں! لمعۂ انوار دکھا دے
اَے حُسنِ بیاں! خوبیِ گفتار دکھا دے
لرزاں ہو قدم خامۂ اعجاز رقم کا
ہاں تیغِ زباں! آج تو کر کام قلم کا

مانی کو بھی حیرت ہو، وہ نقشا نظر آئے
بہتا ہوا اِک نور کا دریا نظر آئے
اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آئے
انصارِ حسینی کا سراپا نظر آئے
مہتاب تو کیا ہے رُخِ خورشید بھی فق ہو
جو بند ہو، تصویرِ تجلّی کا ورق ہو

کرتے ہیں کتابوں میں رقم راویِ صادق
جب قتل ہوا حُرِ سعادت گزارِ موافق
پھر پیاسوں پہ برسانے لگے تیر منافق
مرجانے پہ اِک دل ہوئے سب شاہ کے عاشق
ایک ایک سے پہلے تھا جنہیں دارِ اجل کا
سر کٹ رہے تھے گرم تھا بازار اجل کا

انصار کا کردار

مرنے پہ کسے تھا کمر ایک ایک سے پہلے
کر دیتا تھا سینہ سپر ایک ایک سے پہلے
دیتا تھا بصد شوق سر ایک ایک سے پہلے
کرتا تھا دلِ شہ میں گھر ایک ایک سے پہلے
زرہیں تنِ پرنور میں شیروں کے پڑی تھیں
آنکھیں سپہِ شام کی تیغوں سے لڑی تھیں

لڑتا تھا غضب ایک کے بعد ایک وفادار
دن چڑھتا تھا یاں گرم تھا واں موت کا بازار
سر بیچتے تھے جنسِ شہادت کے طلبگار
بڑھ بڑھ کے خریدار پہ گرتا تھا خریدار
بس پہلے ہم، ایک ایک کی جاں اس پہ اڑی تھی
عقبیٰ کا جو سودا تھا، تو قیمت بھی کڑی تھی

یوں جاتے تھے میدانِ شہادت میں وہ جرار
جس طرح کہ بھڑکی ہوئی بلبل سوئے گلزار
خود روکتے تھے فرق پہ جب آتی تھی تلوار
بارانِ کرم جانتے تھے تیروں کی بوچھار
برچھی جو لگی، نخلِ شہادت میں پھل آیا
جاں آ گئی، جس وقت پیامِ اجل آیا

ایماں شہِ والا کی رضا جانتے تھے وہ
مر جانے کو تو عینِ وفا جانتے تھے وہ
جینے کو ہوس، دم کو ہوا، جانتے تھے وہ
فاقوں کے بیاں کو بھی گلا جانتے تھے وہ
کچھ فرق اطاعت میں وہ ناکام نہ لائے
پانی کا زباں پہ کبھی نام نہ لائے

وہ خشک زبانوں پہ اثر دار دعائیں
لہجے وہ عرب کے، وہ خوش انداز صدائیں
وہ دوش پہ شملے، وہ عمامے، وہ عبائیں
وہ چاند سے چہرے، وہ سفید ان کی قبائیں
نہ حور میں یہ حسن، نہ انساں، نہ پری میں
گویا ملک اترے تھے لباسِ بشری میں

ہمت سے توانا، پہ ریاضت سے بدن زار — مرنے پہ کمر باندھے، شہادت کے طلب گار
غربت، المِ فاقہ کشی، زردیِ رُخسار — سوکھے ہوئے ہونٹوں سے عیاں پیاس کے آثار
تسبیحِ خدائے دو جہاں وردِ زباں تھی
بیداریِ شب نرگسی آنکھوں سے عیاں تھی

عاشق شہِ والا کے، مطیعِ اسد اللہ — سر دینے کو سب ہادیِ کونین کے ہمراہ
مستغنی و حق بین و حق آئین و حق آگاہ — دُنیا کو وہ دیں دار سمجھتے تھے گزرگاہ
فاقوں میں توکّل تھا جنابِ احدی پر
پڑتی تھی نظر ان کی نعیمِ ابدی پر

زخموں کو عطائے صمدی جانتے تھے وہ — آزار کو لُطفِ احدی جانتے تھے وہ
جینے کو مقدر کی بدی جانتے تھے وہ — مرنے کو حیاتِ ابدی جانتے تھے وہ
سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ محمد کی ثنا تھی
دُو رُوز کی پیاس اُن کے لیے آبِ بقا تھی

کیا عاشقِ صادق تھے وہ، کیا مومنِ کامل — دی تھی اُنھیں خالق نے تمیزِ حق و باطل
کیا عقل تھی، کیا فہم تھی، کیا جوش تھا، کیا دِل — کس حُسن سے طے کر گئے وہ عشق کی منزل
بصفتِ گُلِ تر ظلم کے خاروں میں نہ بھولے
محبوب کو تلواروں کی دھاروں میں نہ بھولے

چومے لبِ سوفار جو سینے پہ لگے تیر — دَم عشق کا بھرتے رہے زیرِ دَمِ شمشیر
زخموں کو یہ سمجھے کہ ملا گلشنِ توقیر — تکبیر کا نعرہ تھا زباں پر دَمِ تکبیر
محرابِ عبادت خمِ شمشیر کو سمجھے
جادہ وہ مسافر دَمِ شمشیر کو سمجھے

مسلم سا پیر جو ہو انصار میں تھے فرد ۔ دنیا میں کب ملتے ہیں اس طرح کے ہمدرد
اعدا کے لیے تیغ ہلالی دم نبرد ۔ پیری میں ادا کر گئے سر رحم، بڑھاپے میں جواں مرد
جو عشق تھا سلمان و ابوذر کو نبی سے
ان کو وہی الفت تھی حسین ابن علی سے

یکتا وہ حبیبوں میں حبیب ابن مظاہر ۔ یکساں صفت مہر مبیں باطن و ظاہر
عصیاں سے بری طیب و پاکیزہ و طاہر ۔ جاں باز، جہاں دیدہ، فن جنگ کے ماہر
سر کٹنا تھا پیری سے، قد راست میں خم تھا
اس پر بھی کچھ آگے ہی جوانوں سے قدم تھا

انداز جوانوں کا بھی، پیرانہ سری بھی ۔ پروانۂ جاں باز بھی، شمع سحری بھی
ابرار بھی، دیندار بھی، عصیاں سے بری بھی ۔ زاہد بھی، مجاہد بھی، نمازی بھی، جری بھی
طفلی سے یہ فوج شہ نامی میں رہے تھے
ترسٹھ برس آقا کی غلامی میں رہے تھے

ضرغامہ و وہب و انس و مالک دیں دار ۔ حجاج و زہیر و جبلہ، عامر و عمار
عروہ و شبیب و عمرو عابس ابرار ۔ قربان حسین ابن علی ہو گئے اک بار
جس سمت یہ جاں باز تھے خالی صف پڑا تھا
دور دور تک دشت ستم خوں سے بھرا تھا

انصار کی شہادت

اللہ ری وفا اے رفقائے شہ ذی جاہ! ۔ دل سینوں میں لبریز ولائے شہ ذی جاہ
سر دیتے تھے ہنس ہنس کے برائے شہ ذی جاہ ۔ کرتے تھے سفر چوم کے پائے شہ ذی جاہ
دنیا کی نہ جانب تھیں، نہ دریا کی طرف تھیں
مرتے ہوئے آنکھیں شہ والا کی طرف تھیں

جب ایسے رفیقوں کا پرا ہو گیا خالی ۔ بھرتا تھا دم ہر دو کونین کا والی
پھر تھا کوئی مولا کا نہ ہمدم، نہ موالی ۔ لاشوں کو لگاتے تھے گلے سرورِ عالی

بے تاب تھے اس طرح ہر اک دوست کے غم میں
جیسے کوئی روتا ہے برادر کے الم میں

اعزا کی شہادت

مقتل میں ملایا وہ مرقع جو قضا نے ۔ سر دینے کو تیار ہوئے شہ کے یگانے
دیکھا سوئے افلاک امام دوسرا نے ۔ تسبیح امامت کے بکھرنے لگے دانے

سیدانیوں کا دودھ جو پی پی کے پلے تھے
جلادوں کی تلواریں تھیں اور ان کے گلے تھے

لاکھوں سے لڑے حضرتِ عباس کے بھائی ۔ حملوں میں دکھائی شہ مرداں کی لڑائی
سب شان پدر بیٹوں نے جعفر کے دکھائی ۔ مسلم کی جو میراث تھی، فرزندوں نے پائی

لاکھوں میں پھر اس شان سے شاہ دو جہاں تھے
دو طفل جلو میں فقط اور تین جواں تھے

بقیۃ السیف

زینب کے پسر، جعفر و زہرا کے دل و جاں ۔ قاسم، حسن سبز قبا کا سر تاباں
ہم شکل نبی، نورِ نگاہ شہ ذی شاں ۔ عباس علی، چشم و چراغ شہ مرداں

تاباں نظر آتا تھا قمر پاس قمر کے
پانچوں یہ جری چاند تھے شبیر کے گھر کے

ایک ایک جری زیورِ جنگی کو سنوارے ۔ نیزوں کی چمک اور وہ سمندوں کے طرارے
جعفر کے جگر بند، ید اللہ کے پیارے ۔ رستم سے ہر اک جنگ کرے، شیر کو مارے

تیار ہو مرحب سا، تو شمشیر سے ماریں
ارجن سے کماں دار کو اک تیر سے ماریں

ایک ایک جواں ملکِ شجاعت کا شہنشاہ — بچے وہ اولوالعزم کہ اَلعظمۃُ للہ!
ذی قدر، سرافراز، وفا کیش، دل آگاہ — شیر اُن کی نظر دیکھ کے بن جاتے تھے روباہ

پیدا یہ تہوّر سے کہ لاکھوں میں تو کیا ہیں
دعوی تھا ہر اک کو کہ ہمیں شیرِ خدا ہیں

کھولے ہوئے رایت، کوئی تولے ہوئے شمشیر — بے تاب کہ تلوار کے چلنے میں ہو کیوں دیر
فاقوں میں زبردست کہ لاکھوں سے نہ ہوں زیر — بیٹھے ہیں، پلے جو اسداللہ کے وہ شیر

جز سجدۂ حق سر کبھی اُن کے نہ جھکے تھے
یہ قبلۂ عالم کا ادب تھا جو رُکے تھے

عون و محمد کا جہاد

جب دے چکے سب غیر عزیزوں کی طرح سر — گوشہ کے یگانے بھی سدھارے سوئے کوثر
مرنے پہ کمر باندھتے تھے قاسم بے پر — کہتی تھی جھکائے ہوئے سر زینبِ مضطر

"ہے سخت عجب دونوں کی دانائی سے مجھ کر
اِن بیٹوں نے محجوب کیا بھائی سے مجھ کو

"سب جاتے ہیں اور رن کی یہ رخصت نہیں لیتے — مر جانے کی ماموں سے اجازت نہیں لیتے
سیّد سے سرفرازی کا خلعت نہیں لیتے — سر دے کے جو ملتی ہے، وہ دولت نہیں لیتے

پانی نہ ملے گر دمِ آخر، نہ ملے گا
کہہ دے کوئی، ایسا تمہیں دن پھر نہ ملے گا

"وہ نام پہ مرتے ہیں، جو ہیں عاقل و ذی ہوش — سب دل میں کہیں گے، کہ ہوئے جنگ سے روپوش
موقع ہو، تو گویا کہیں رہتے ہیں خاموش — کیا جانے کا پھر دھیان، شجاعت کا ہو جب جوش

شیروں کا، دلیروں کا، تو یہ طور نہیں ہے
بس مرنے سے ڈرتے ہیں، یہ کچھ اور نہیں ہے

"آتا ہے دمِ صبح سے یاں لاشے پہ لاشا — ان کے لیے لوروں کی لڑائی ہے تماشا
پائی نہ اجازت، یہ سخن، خوب تراشا — باتیں ہیں یہ ساری، مجھے باور نہیں حاشا

رُکتے ہیں دلاور کہیں رُد کے سے کسی کے
وہ سب بھی تو پیارے تھے حسین ابنِ علی کے"

بانو نے کہا "دونوں کی عمریں ہیں ابھی کیا — نہ گھر سے وہ نکلے، نہ کوئی معرکہ دیکھا
میداں کی رضا دیتے نہ ہوں گے شہ والا — آزردہ نہ ہوں آپ، یہ غصّے کی نہیں جا
سُن لیجیے گا، رن میں جو کچھ کام کریں گے
حیدر کے نواسے ہیں، بڑا نام کریں گے"

فرمایا کہ "ہاں! جو مجھے تقدیر دکھائے — جی جاؤں گی، مر کر جو وہ میدان سے آئے
کیوں شاہ سے رخصت کا سخن لب پہ نہ لائے — کیا جانیے کس فکر میں ہیں، مرے جائے
جو چاہیں کریں، بیٹوں کے قابل میں کہاں ہوں
اب وہ مرے فرزند نہ میں دونوں کی ماں ہوں"

ناگاہ ہوا شور مبارز طلبی کا — پھر قصد لعینوں نے کیا بے ادبی کا
منہ سرخ ہوا غیظ سے ہم شکلِ نبی کا — رایت بھی بڑھا فوجِ رسولِ عربی کا
حیدر کے نواسوں کے بھی ابرو پہ بل آیا
چھوٹا تو یہ بگڑا کہ پرے سے نکل آیا

گھبرا کے پکارے جو اُسے سیدِ ابرار — بس پھر کے گرے پاؤں پہ آقا کے وہ جرار
کی عرض بصد عجز کہ "اے کل کے مددگار — ہم دونوں غلام اب ہیں اجازت کے طلب گار
بے تاب ہیں، دل جان لڑائی میں لڑی ہے
اے نورِ خدا! ذرہ نوازی کی گھڑی ہے

"بسمل جو ہوئے مسلمِ مظلوم کے پیارے — ہم خیمے میں جا سکتے نہیں شرم کے مارے
اماں نے کہا ہوگا کہ اب تک نہ سدھارے — جانوں کو بچاتے ہیں جگر بند ہمارے
قاصر ہیں، جو توقیرِ شہادت نہیں ملتی
کیا جانیں رہے وہ، کہ اجازت نہیں ملتی

"حضرت یہ ہی روشن، جو ہمارا ہی ارادا
سن کم ہیں، یہ ہمت ہی جوانوں سے زیادا
نانا ہیں علی، جعفر طیار سے دادا
ہم ڈھونڈھتے ہیں صبح سے فردوس کا جادا

شیروں کی طرح بیشۂ حیدر میں پلے ہیں
تلوار سے ہم کھیل کے اس گھر میں پلے ہیں

"ہم دونوں غلام اکبر و اصغر کے ہیں یا شاہ!
اُلفت کو بس اب دل سے اُٹھا دیجیے للہ
اماں کا تو نازک ہے مزاج، آپ ہیں آگاہ
بنتِ اسد حضرتِ باری ہیں وہ ذی جاہ

پوچھیں گی خفا ہو کے، تو کیا ان سے کہیں گے
آزردہ ہوئیں وہ، تو کہیں کے نہ رہیں گے

"عورت ہیں یہ خوبو شہ مرداں کی ہے ساری
شب کو بھی یہ فرمایا تھا ہم سے کئی باری
تم یہ نہ سمجھو کہ میں عاشق ہوں تمھاری
بھائی سے مجھے جان، نہ اولاد ہے پیاری

کس کام کے پھر سر جو تصدق نہ کروگے
تب دُودھ میں بخشوں گی جو عزت سے مروگے"

یہ کہہ کے جو رونے لگے زینب کے جگر بند
حضرت نے کہا "میں ہوں بہر حال رضامند
کھوئے ہیں کسی بھائی نے ہمشیر کے فرزند؟
کس مُنھ سے کہوں آہ! کہ ہو خاک کے پیوند

تنہائی کے دُکھ فاطمہ کا لال سہے گا
لاشے کے اُٹھانے کو بھی کوئی نہ رہے گا"،

فضہ درِ خیمہ سے یہ کہتی ہوئی آئی
"فریاد! کہ اب لٹتی ہے زینب کی کمائی
لو میرے سر خوزادوں نے رضا جنگ کی پائی
اے بنتِ علی! رو رہے ہیں آپ کے بھائی

بچے بھی شریکِ شہدا ہوتے ہیں لوگو!
دو بھانجے ماموں پہ فدا ہوتے ہیں لوگو!"

زینب نے کہا "میری مُراد آئی سدھاریں تینوں میں گوارا ہوں مرے دودھ کی دھاریں
دشمن ہوں جو فرزند علی کے، انھیں ماریں لڑنے پہ چڑھیں، شمر کا سر تن سے اُتاریں
یہ کس کا ہو دیکھ کے وہ جوش میں آئے
جب مر چکے دو بھائی، تو یہ ہوش میں آئے"

خیمے میں یہ باتیں تھیں کہ آئے وہ دلاور دیکھا کہ الگ بیٹھی ہوئی روتی ہے مادر
ساتھ اپنے انھیں لے کے گئی بانوئے مضطر کی عرض کہ "چھاتی سے لگا لو انھیں خواہر!
یہ نورِ نظر لائقِ الطاف و عطا ہیں
تقصیر ہوئی کیا، جو حضور ان سے خفا ہیں؟"

منھ پھیر کے یہ کہنے لگیں شاہ کی ہمشیر "غیرت کی ہے جا، غیر تو ہوں فدیۂ شبیر
منھ پھیریں یہ مقتل سے، جو ہوں صاحبِ شمشیر شکوہ ہے مقدر کا، یہ کچھ ان کی نہیں تقصیر
انصاف تو کیجے مجھے کیونکر نہ گلا ہو
وہ پہلے نہ بے دم ہوں، ہو جن میں ملا ہو

"حُر کون تھا اور کون ہے قینِ بجلی؟ ہے عرش تلک جن کے ستاروں کی تجلّی
کیونکر ہو بھلا مادرِ مضطر کی تسلّی مقتل میں یہ کوتاہیاں، گھر میں یہ تعلّی
آفت ہے، یگانے ہی جو ہمت نہ کریں گے
یہ کس نے کہا تھا کہ ہمیں پہلے مریں گے

"کیوں روتے ہیں؟ کیا سر سے مرے چھن گئی چادر؟ خالی ابھی ہونے دیں محمدؐ کا بھرا گھر
وقت آئے تو دکھلائیں گے تلوار کے جوہر جرأت میں یہ جعفر ہیں، شجاعت میں یہ حیدر
جب کوئی نہ ہووے گا، تو یہ جنگ کریں گے
کیا عیب ہے، پہلے نہ مرے بعد مریں گے

"تلواروں میں دم عشق کا بھرتے ہیں وفادار؟ سر دینے میں سبقت کہیں کرتے ہیں وفادار؟
موقع ہو تو دنیا سے گزرتے ہیں وفادار سردار سے پہلے کہیں مرتے ہیں وفادار
کھلتا نہیں، یہ جوشِ شجاعت انھیں کیوں ہے
حضرت تو سلامت ہیں، یہ عجلت انھیں کیوں ہے

"فرزندِ حسن مرنے کو جالیں، تو یہ جائیں عباس علی خوں میں نہالیں، تو یہ جائیں
ہم شکلِ نبی برچھیاں کھالیں، تو یہ جائیں لاشے ابھی شہزادوں کے آلیں، تو یہ جائیں
خنجر دلِ زہرا پہ جو چل لے، تو سدھاریں
ماں خیمے سے سر ننگے نکل لے، تو سدھاریں

"میں سمجھی تھی پہلے ہی، یہ ڈھونڈھیں گے بہانا کچھ منھ کا نوالہ نہیں تلواروں کا کھانا
لازم تھا اسی وقت انھیں خیمے میں آنا سچ ہے کہ وفاداروں سے خالی ہے زمانا
جس تیغ میں تاثیر زبانوں میں نہیں ہے
غیروں میں اب الفت ہے، یگانوں میں نہیں ہے

"نادان ہیں، بچے ہیں، یہ کیا وقت کو جانیں سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ پھراتے ہیں زبانیں
واں تیغوں میں تابش ہے، کڑکتی ہیں کمانیں جو نام پہ مرتے ہیں، وہ دے دیتے ہیں جانیں
مذکور بزرگانِ خوش اوقات تو رہ جائے
جانیں نہ رہیں گر، نہ رہیں، بات تو رہ جائے

"ماں کو تو سبک کر چکے کنبے کی نظر میں میں لٹ گئی اس رنج و مصیبت کے سفر میں
پوچھے کوئی ان سے، کہ یہ کیوں آئے ہیں گھر میں کھولیں انھیں، باندھے ہیں جو ہتھیار کمر میں
فوجوں میں یہی طور تھے خالق کے ولی کے؟
تو ناز ہے اس پر کہ نواسے ہیں علی کے

"توڑ آئے ہوں خیبر سے کسی در کو، تو کہہ دیں — مارا ہو جو مرحب سے دلاور کو، تو کہہ دیں
تا کوفہ بھگا آئے ہوں لشکر کو، تو کہہ دیں — خوشنود کیا ہو جو برادر کو، تو کہہ دیں
چپ کیوں ہیں، جو نصرت کی خبر لے کے پھرے تھے؟
کیا شام کے سردار کا سر لے کے پھرے ہیں؟"

یہ ذکر تھا، جو خیمے میں داخل ہوئے شبیر — دیکھا کہ ہیں بیٹھی ہوئی خفا زینبِ دلگیر
فرمایا "شکایت کے سخن کیجو نہ ہمشیر — ملتے ہیں کسے ایسے پسر صاحبِ توقیر
تلواروں میں ہر دم مرے قدموں پہ جھکے تھے
یہ شیر دلاور مرے روکے سے رکے تھے

"مالک ہو تم ان دونوں کی، بگڑو کہ خفا ہو — بہتر ہے وہ غصہ، جو مناسب ہو، بجا ہو
ایسے ہیں، کہ حق دودھ کا ان سے نہ ادا ہو؟ — میں کیا کروں، گر دونوں کا مرنا تمھیں چاہا ہو
سمجھا میں، کہ ہاتھوں سے انھیں کھو دو گی زینب
جب یہ نہ ملیں گے، تو بہت روؤ گی زینب"

زینب نے کہا "آپ الم ان کا نہ کیجے — طالب ہیں، تو بہتر ہے، اجازت انھیں دیجے
قربان ہیں سب بھانجے ہوں یا کہ بھتیجے — گر دھیان ہے میرا، تو قسم رونے کی لیجے
بیٹے بھی فدا آپ پہ ہیں، میں بھی فدا ہوں
دیر اتنی ہوئی کیوں، میں اسی پہ تو خفا ہوں"

تھرا کے وہ بولے کہ "ہماری نہیں تقصیر — قسمت میں خجالت تھی، نہ یاور ہوئی تقدیر"
فرمایا "شجاعت کے منافی ہے یہ تقریر — مسلم کے پسر کاہے کو تھے صاحبِ شمشیر
جاتے ہوئے کس دوست کو آقا نے نہ روکا
روکا تمھیں، ان کو شہِ والا نے نہ روکا؟

ماں سے رخصت

"جو مرد ہیں، پہلے وہی مر جاتے ہیں، پیارو — آزردہ تھی، پر خیر میں اب خوش ہوں اسد وارو
صدقے گئی، الجھی ہوئی زلفیں تو سنوارو — واری یہ تمنا ہے، کہ سر ماموں پہ وارو
مرنے کے جسے پاتے ہیں، وہ راہ یہی ہے
صدقے گئی، شادی ہے یہی، بیاہ یہی ہے"

پوشاک بدل کر جو سجے جنگ کے ہتھیار — غل تھا کہ چلے شاہ کی ہمشیر کے دلدار
مجرے کو جھکے ماں کے، جو وہ آئینہ رخسار — سینے میں تڑپنے لگا زینب کا دلِ زار
فرمایا "ادا سر سے کرو حق شہ دیں کا
لو جاؤ، مبارک ہو سفر خلد بریں کا

ماں کی ہمت افزائی

"اعدا کو مرے دودھ کی تاثیر دکھانا — دادا کی طرح جوہر شمشیر دکھانا
اجلال حسن، شوکت شبیر دکھانا — تن تن کے یہ اشتر کی تصویر دکھانا
نیزوں سے جوانوں کے جگر توڑ کے آنا
خیبر کی طرح کوفے کا در توڑ کے آنا

"نیزوں کی طرف چھاتیاں تانے ہوئے جانا — ہاں! تیروں کی بارش میں سپر منھ پہ نہ لانا
ہنس ہنس کے، میں قربان گئی، برچھیاں کھانا — لازم ہے وہ ہمت، کہ معرف ہو زمانا
اس جنگ کا چرچا سحر و شام رہے گا
دنیا میں اگر تم نہ رہے، نام رہے گا

"میلے نہ ہوں تیور، یہ سپاہی کے ہنر ہیں — جس کے ہیں سب اُس کے ہیں، جدھر ہیں سب اُدھر ہیں
گہ عطر میں ڈوبے ہیں، گہے خون میں تر ہیں — صحبت میں مصاحب ہیں، لڑائی میں سپر ہیں
وہ اور کسی سے نہ جھکیں گے، نہ جھکے ہیں
عزت میں فرق آئے، کہ سر نیچے جھکے ہیں

"دریا کی طرف پیاس میں تکتے نہیں غازی — گر شیر بھی جھپٹے، تو سَرَکتے نہیں غازی
تلواروں میں آنکھوں کو جھپکتے نہیں غازی — بجلی بھی گرے گر، تو جھجکتے نہیں غازی
دم ہونٹوں پہ آئے، تو شجاعت نہیں جاتی
مرنے پہ بھی چہرے کی بشاشت نہیں جاتی

"خندق کی لڑائی کی طرح جنگ کو جھیلو — بچے اسد اللہ کے ہو، جان پہ کھیلو
تیغوں میں دھنسو، چھاتیوں سے نیزوں کو ریلو — کوفے کو تہ تیغ کرو، شام کو لے لو
دو اور جِلا آئینۂ تیغِ عرب کو
لو روم کو قبضے میں، تو قابو میں حلب کو

جاں ہونٹوں پہ آجائے اگر پیاس کے مارے — غش کھا کے جو گرو بھی، تو دریا کے کنارے
پانی کو ترستے رُفقا مر گئے سارے — یہ آبِ رواں بند ہو ناموں پہ تمہارے
تلواریں ہیں، موجوں کی روانی نہ سمجھنا
دریا ہو لہو کا، اسے پانی نہ سمجھنا"

کی عرض "یہی ہوئے گا اے مادرِ غمخوار! — کیا بات ہے، جیتے ہیں، تو مرنا نہیں دشوار
اس پیاس میں صابر ہیں غلامانِ وفادار — دریا کو نظر بھر کے جو دیکھیں تو گنہگار
دھبّے گا سزا، فرقِ اطاعت میں گر آئے
پھر دیکھیں نہ منہ آپ جو رُخ تک سپر آئے"

امام حسین سے رخصت

آداب بجا لا کے وہ صفدر نکل آئے — اک بُرج سے دو چاند برابر نکل آئے
رومال رکھے آنکھوں پہ اکبر نکل آئے — شبیر بھی روتے ہوئے باہر نکل آئے
قدموں پہ جھکے وہ جو شہنشاہِ زمن کے
کس صبر سے رخصت کیا بیٹوں کو بہن کے

پھر آپ نے خود دونوں کو گھوڑوں پہ چڑھایا   دونوں نے شرف پایۂ معراج کا پایا
بجلی کا سب انداز سمندوں نے دکھایا   دوڑے کہ دکھائی نہ دیا دھوپ میں سایا
میداں کی طرف بائیں سے باں رہ گئی تک کر
پنہاں ہوئے بدلی میں ستارے سے چمک کر

آمد

گھوڑوں کو اُڑاتے ہوئے پہنچے جو بہادر   فوجِ ستم آرا ہوئی سب غرقِ تحیّر
اک شور ہوا کون سے دریا کے ہیں یہ دُر   لڑکے ہیں، پہ اللہ رے اقبال و تہوّر
کیا جانیے، کیا نام ہیں ان کے اَب و جد کے
تیور سے یہ پیدا ہے، کہ بچے ہیں اسد کے

پیشانیاں خورشیدِ جہاں تاب سے بہتر   رخسارے رنگیں گلِ شاداب سے بہتر
دانتوں کی صفا گوہرِ نایاب سے بہتر   چہروں کا عرق موتیوں کی آب سے بہتر
ابرو نہیں پیشانیِ ذی قدر کے نیچے
ہیں دو مہِ نو بال سے اک بدر کے نیچے

وہ صاعقے لشکر پہ چمکتے ہوئے آئے   شعلے تھے، کہ آندھی میں لپکتے ہوئے آئے
وہ شیر صفِ جنگ کو تکتے ہوئے آئے   وہ گُل تھے ہوا پر کہ مہکتے ہوئے آئے
تھا شور، کہ ہوش اُڑتے ہیں یاں کبکِ دری کے
گھوڑے نہیں، جھونکے ہیں نسیمِ سحری کے

کیا دونوں کو اسپانِ سبک تاز ملے تھے   جاں بازوں کو رہوار بھی جاں باز ملے تھے
فتراک نہیں تھے، پرِ پرواز ملے تھے   زینت کے لیے سازِ خدا ساز ملے تھے
شیروں کا بھی یہ رعب دمِ جنگ نہیں ہے
رستم کا کمر بند ہے، یہ تنگ نہیں ہے

غصے میں جو ہر بار ٹھہر جاتے ہیں چل کے — آنکھوں نے نیا حسن دکھایا ہے اُبل کے
اس طرح قدم خاک پہ رکھتے ہیں سنبھل کے — گر ہاتھ میں ہو جام لبالب، تو نہ چھلکے
ہر گام پہ اُڑ جانے کو تیار ہیں دونوں
بچوں کی سواری سے خبردار ہیں دونوں

پڑھنے لگے اشعار رجز جب وہ دلاور — اللہ ری فصاحت! فصحا ہو گئے ششدر رجز
ہر بیت تھی دشمن کے لیے تیغ دو پیکر — ہر مصرع برجستہ میں تھی تیزی خنجر
دے کون جواب ان کا کہ دم بند تھا سب کا
واں قافیہ تھا تنگ شجاعانِ عرب کا

اظہار نسب میں جو محمدؐ کا لیا نام — سب پڑھنے لگے صلِّ علیٰ صاحبِ اسلام
آگے جو بڑھے نام علی لے کے وہ گلفام — دل ہل گئے، تھرانے لگا روم سے تا شام
جعفر کا جو کچھ ذکر کیا بعد علی کے
مجرے کو علم جھک گئے سب فوجِ شقی کے

وہ شان، وہ اجلال، وہ شیروں کی نگاہیں — نعرے جو کیے، بند ہوئیں امن کی راہیں
دعویٰ کہ "فنا کر دیں ابھی ہم، جسے چاہیں — ہمت وہ کہ جو منہ سے کہیں، اس کو نباہیں
فوجوں کو بھگایا ہے، تو ہم بڑھ کے تھمے ہیں
سرکے نہیں، جب کھیت میں پاؤں جمے ہیں

"یہ فوج ہے کیا، آگ کا دریا ہو تو جھیلیں — کیا ڈر انھیں، بچپن میں جو تلواروں سے کھیلیں
کوفہ تو ہے کیا، شام کو اور روم کو لے لیں — اُٹھیں صفتِ کاہ، اگر کوہ کو ریلیں
چاہیں، تو زمیں سے ابھی ساتوں طبق الٹیں
یوں اُلٹیں، کہ جس طرح ہوا سے ورق الٹیں

"فوجوں کی صفائی جو نہ دیکھی ہو، تو دیکھو — لشکر میں دہائی جو نہ دیکھی ہو، تو دیکھو
ہاں قلعہ کشائی جو نہ دیکھی ہو، تو دیکھو — بچوں کی لڑائی جو نہ دیکھی ہو، تو دیکھو
یہ منہ کبھی تیغوں سے پھرے ہیں، نہ پھریں گے
مرتے ہوئے دس بیس قدم بڑھ کے گریں گے

"تم سب میں شجاعت کا دھنی جو ہو، وہ نکلے — بدخواہ امام مدنی جو ہو، وہ نکلے
آمادۂ شمشیر زنی جو ہو، وہ نکلے — سردفتر لشکر شکنی جو ہو، وہ نکلے
تنہا نہیں آ سکتے، تو فوجیں بہم آئیں
کیا دیر ہے، گر تم نہیں بڑھتے، تو ہم آئیں"

جنگ

یہ ذکر ابھی تھا، کہ خدنگ آئے اُدھر سے — شمعوں کی طرف اُڑ کے پتنگ آئے اُدھر سے
سرہنگ و جفا جو پئے جنگ آئے اُدھر سے — یاں سے جو بڑھے لعل، تو سنگ آئے اُدھر سے
ڈھالیں تھیں بہم، گرز بھی ہاتھوں میں تُلے تھے
نیزے بھی چمکتے تھے، پھریرے بھی کھلے تھے

کڑکیں وہ کمانیں، وہ ہوا فوج میں کڑکا — تیغوں کی سفیدی تھی، کہ تھا نور کا تڑکا
گہہ بجھ گیا خورشید کا شعلہ، کبھی بھڑکا — ہر دل کو ہلا دیتا تھا سرکشی کا دھڑکا
نعرے تھے، کہ حیدر کے دلیروں سے وغا ہے
گھوڑے بھی بھڑکتے تھے، کہ شیروں سے وغا ہے

دانتوں میں شجاعانِ عرب ڈاڑھیاں دابے — وہ صورتیں خوں خوار، وہ گھوڑے دو رکابے
وہ گردنیں، وہ سر تھے، کہ معکوس قرابے — وہ آگ کے پتلے تھے، تو شبدیز شتابے
خوں آلِ محمد کا بہایا، تو انھیں نے
سادات کے خیموں کو جلایا، تو انھیں نے

قبضوں پہ ادھر ہاتھ سلحشوروں نے ڈالے — تیر آئے کمانوں سے، بڑھے ظلم کے بھالے
یاں تیغے شیروں نے نیاموں سے نکالے — فوجوں پہ چلے شاہ کے آغوش کے پالے
اک برق گری لشکر بد خو کی صفوں پر
دو شیروں نے حملہ کیا آہو کی صفوں پر

اے سیف زباں! تازہ لڑائی مجھے دکھلا — اے تیغ علی! قلعہ کشائی مجھے دکھلا
شمشیر طلاقت کی صفائی مجھے دکھلا — اے ذہن رسا! اپنی رسائی مجھے دکھلا
ہستی کو ہے موجود وہ صفدر، جو علی ہے
پھر کھینچ وہ تلوار، جو سو بار چلی ہے

گو پیر ہوں، پر زور جوانی ہے ابھی تک — سوکھے ہوئے دریا میں روانی ہے ابھی تک
دنداں نہیں، پر تیز زبانی ہے ابھی تک — قبضے میں وہ تیغ صفہانی ہے ابھی تک
جوہر بھی وہی، باڑھ وہی، گھاٹ وہی ہے
کہنہ تو ہے شمشیر، مگر کاٹ وہی ہے

یا شیر خدا! سیف دو دم دیجیے مجھ کو — یا شاہ نجف! طبل و علم دیجیے مجھ کو
سر بہ نہ ہو لشکر، وہ حشم دیجیے مجھ کو — میداں جو نہ چھوڑے، وہ قلم دیجیے مجھ کو
نیزے پہ شام کے ہٹتے نظر آئیں
سب فوج کے چہرے ابھی کٹتے نظر آئیں

تصویر پریشانی کفار دکھا دوں — غیظ و غضب حیدر کرار دکھا دوں
جعفر کو ابھی جنگ پہ تیار دکھا دوں — ہر بند پہ چلتی ہوئی تلوار دکھا دوں
رخ سب قدر اندازوں کے پھرتے نظر آئیں
سرداروں کے سر خاک پہ گرتے نظر آئیں

لو نیمچے شہزادوں کے چلتے ہیں، خبردار! / لو بانبیوں سے ناگ نکلتے ہیں، خبردار!
رنگ ان کی خوں خوار بدلتے ہیں، خبردار! / لو مارِ سیہ زہر اُگلتے ہیں، خبردار!
جل جاتا ہے وہ، آنچ ذرا لگتی ہے جس کو
پڑ جاتے ہیں نیل، ان کی ہوا لگتی ہے جس کو

موت آئی اُدھر، نیمچے دونوں جدھر آئے / جب ہاتھ بڑھا، پاؤں پہ کٹ کٹ کے سر آئے
گہ سینے تلک آئے، تو کبھی تا کمر آئے / خالی نہ پھرے، جس پہ گئے، خوں میں بھر آئے
ہر نیمچہ بجلی تھا ستم گاروں کے حق میں
ڈوبے ہوئے تھے دو مہِ نو خوں کی شفق میں

اٹھتی نہ تھی ڈر سے کسی خوں خوار کی گردن / سر خود کا جھکا جاتا تھا، تلوار کی گردن
دو چار کے منہ کٹ گئے، دو چار کی گردن / اسوار کا سر اُڑ گیا، رہوار کی گردن
دو نیمچے بجلی سے گزرتے تھے کمر سے
آدھے ہوئے جاتے تھے لعین جان کے ڈر سے

غارت تھی وہ صف جس سے دغا کرکے پلٹے وہ / دو ہاتھ میں سو سو کو فنا کرکے پھرے وہ
سرداروں کے سر تن سے جدا کرکے پلٹے وہ / ہر غول میں اک حشر بپا کرکے پھرے وہ
غل تھا کہ پرے ڈٹے ہوئے جم نہیں سکتے
سر کٹنے کی دہشت سے قدم تھم نہیں سکتے

گھوڑے تھے کہ چھلاوا، کبھی یاں تھے کبھی واں تھے / پُتلی میں تو پھرتے تھے، پر آنکھوں سے نہاں تھے
یاں تھے جو بڑھے، تو اُدھر گرم عناں تھے / بجلی تھے کسی جا، تو کہیں آبِ رواں تھے
ہو سکتی تھی چیتے سے یہ سرعت نہ ہرن سے
جھونکے تھے ہوا کے کہ نکل جاتے تھے سن سے

بے آب تھے دو دن سے، پہ جاں دار تھے گھوڑے
ہر مرتبہ اُڑ جانے پہ تیار تھے گھوڑے
اُس پار کبھی تھے، کبھی اِس پار تھے گھوڑے
نقطہ تھی وہ سب فوج، کہ پرکار تھے گھوڑے
دس بیس جو مر جاتے تھے ٹاپوں سے کچل کے
بڑھ سکتا نہ تھا اک بھی احاطے سے اجل کے

تانے ہوئے سینوں کو جدھر جاتے تھے دونوں
تلواروں کی موجوں سے گزر جاتے تھے دونوں
ہر غول میں بے خوف و خطر جاتے تھے دونوں
سب ہوتے تھے پسپا تو ٹھہر جاتے تھے دونوں
اُلٹی ہوئی صف دیکھ کے ہنس دیتا تھا بھائی
بھائی کی طرف دیکھ کے ہنس دیتا تھا بھائی

مقتل سے جری تیغ و سپر چھوڑ کے بھاگے
ہلچل تھی، کہ بیٹوں کو پدر چھوڑ کے بھاگے
یوں روح کے طائر تن و سر چھوڑ کے بھاگے
جیسے کوئی بھونچال میں گھر چھوڑ کے بھاگے
یوں بھاگتے تھے شیر، کہ دم بھول گئے تھے
دہشت تھی، کہ وحشت کو ہرن بھول گئے تھے

وہ ہاتھ، وہ اُن چھوٹی سی تلواروں کے پرتو
چلنے میں جو بجلی، تو ٹھہرنے میں مہِ نو
سرپٹ میں وہ نیرنگیٔ اسپانِ سبک رو
دو ہاتھ جدھر چل دیئے سر اُڑ گئے سو سو
چلتی تھی غضب تیز ہوا دشتِ وغا میں
کیا چیز تھے پتے، ثمر اُڑتے تھے ہوا میں

ٹوٹی ہوئی صف عہد شکن دیکھ کے بھاگے
حیدر کی لڑائی کا چلن دیکھ کے بھاگے
نامرد فراقِ سر و تن دیکھ کے بھاگے
بپھرے ہوئے شیروں کو ہرن دیکھ کے بھاگے
دریا پہ بھی ڈر سے کوئی ٹھہرا نہیں جاتا
بھاگڑ میں یہ ہے شور کہ ٹھہرا نہیں جاتا

کیا دخل، جو قابو میں سوار آکے نکل جائے   کیا جان، جو بھاگڑ میں جگہ پاکے نکل جائے
کیا تاب، جو گھوڑا کوئی چمکا کے نکل جائے   کیا منہ ہے، جو تلوار کوئی کھا کے نکل جائے
جز کُنجِ لحد اور کہیں امن نہیں تھا
ٹپکا جسے ریتی پہ، وہ پیوندِ زمیں تھا

بھالوں میں جو تیغوں کو سنبھالے نظر آئے   افسر نظر آئے، نہ رسالے نظر آئے
ریتی پہ تپاں برچھیوں والے نظر آئے   ہر صف کی جگہ خون کے تھالے نظر آئے
غُل تھا، کہ رَن ایسا کبھی پڑتے نہیں دیکھا
بچّوں کو اس انداز سے لڑتے نہیں دیکھا

جانبازیاں دکھلاتے تھے میداں میں وہ جانباز   دل تھامے ہوئے دیکھتے تھے شاہِ سرافراز
قاسم کا سخن تھا، کہ علی کا ہے یہ انداز   فرماتے تھے اکبر، یہ لڑائی ہے کہ اعجاز
بڑھتے تھے کبھی، گاہ سرک جاتے تھے عباس
جب وار وہ کرتے تھے پھڑک جاتے تھے عباس

بہتے ہوئے دریا کا بھی کیا شور گھٹا ہے   ڈھالوں کی سیاہی ہے کہ گھنگھور گھٹا ہے
تلواریں برستی ہیں، سلحشور گھٹا ہے   مقتل میں برستا ہے لہو، زور گھٹا ہے
ڈوبے ہوئے ہیں خوں میں پرے فوجِ عدو کے
بوچھار سروں کی ہے، ڈھیر پڑے ہیں لہو کے

بے دست تھا، نیزے کو اُدھر جس نے اٹھایا   جاں اُس کی گئی، زخمِ جگر جس نے اٹھایا
ضرب اُس پہ چلی، فوج میں سر جس نے اٹھایا   تیغے سے اُڑا ہاتھ، تبر جس نے اُٹھایا
کیسے قدر انداز، خطا کار کہاں کے
ترکش تھا، نہ چلّہ تھا، نہ گوشے تھے کماں کے

باندھا کسی برچھی نے نیزے کا اگر بند — وا کر دیا بس ناخن تدبیر نے ہر بند
نعرہ تھا، کہ "ہم عقدہ کشا کے ہیں جگر بند — کھولیں اسے، خیبر سا اگر ہو کوئی در بند
بھولے ہو تم اس پر، کہ تنومند نہیں ہیں
یہ ہاتھ کسی معرکے میں بند نہیں ہیں"

غل تھا، کہ نہ دیکھی تھی وغا آج تک ایسی — آفت کسی لشکر پہ نہ ڈالے فلک ایسی
دوزخ کے بھی شعلوں میں نہ ہوگی لپک ایسی — زائل ہوئی جاتی ہے بصارت، چمک ایسی
آفت تھی، قیامت تھی، اسے یا اسے دیکھیں
دو بجلیاں گرتی ہیں برابر، کسے روکیں

وہ غل عربی باجوں کا، وہ تیغوں کی جھنکار — قرنا کی صدا وہ، کہ ہلے گنبد دوّار
کالی وہ گھٹا شام کے لشکر کی دھواں دھار — بڑھ بڑھ کے یہ کرکیت صدا دیتے تھے ہر بار
ہاں آج نمود سپہ شام کا دن ہے
اے لشکریو! نام کرو، نام کا دن ہے

ہر غول پہ، ہر صف پہ چلے تیغے ان کے — مارا انھیں، جن جن کے بڑے نام تھے جن کے
کشتہ کیا گنتی کے سواروں کو جو گن کے — تھرانے لگے دانتوں میں سب اب کے تنکے
فوجیں وہ کہاں، اور کہاں تشنہ وہاں وہ
دو لاکھ کے لشکر میں یہ غل تھا، کہ اماں دو

یہ کہتے تھے، "لشکر کا نشاں دو، تو اماں دیں — دنیا کی محبت پہ نہ جاں دو، تو اماں دیں
ہاں صلح کی حضرت کو زباں دو، تو اماں دیں — اصغر کو جو یہ آب رواں دو، تو اماں دیں
خون پسر سعد بہا دو، تو رکیں ہم
ہاں شمر کا سر کاٹ کے لا دو، تو رکیں ہم

"بتلاؤ ہمیں، خولیِ خوں خوار کدھر ہے   شیث ابن ربعی سا جفاکار کدھر ہے
ازرق جسے کہتے ہیں، وہ مکار کدھر ہے   کیوں حرملۂ سرکش و بدکار کدھر ہے
ہم پیچھے جھکا کے بڑھاتے ہیں فرس کو
ہاں بھیج دو میداں میں سنان ابنِ انس کو"

کھانے لگی گھونگھٹ جو سپاہِ ستم آرا   بڑھ کر عمرِ سعد نے جوانوں کو پکارا
"جاتے ہو کہاں چھوڑ کے دریا کا کنارا   منھ کس کو دکھاؤ گے، یہ سوچو تو خدارا
دو لاکھ ہو، دو بچوں کے سر لا نہیں سکتے
ہاں تیر لگاؤ، جو قریں جا نہیں سکتے"

شہادت

یہ سنتے ہی سب شام کا بادل امنڈ آیا   اک دل کا ہٹانا تھا، کہ اک دل امنڈ آیا
اک ظلم کا دریا سوئے مقتل امنڈ آیا   نیزوں کا نیستاں تھا، کہ جنگل امنڈ آیا
پاس آکے لڑا ایک، اس فوجِ عدو میں
نہلا دیا بوچھار نے تیروں کی لہو میں

زخمی ہوئے جب شبیر، تو لشکر میں در آئے   آفت ہوئی برپا، غضب آیا، جدھر آئے
وہ پیچھے جب سن سے کسی غول پر آئے   ہاتھ اڑ کے گئے واں، تو اِدھر کٹ کے سر آئے
دونوں کے فرس ابر کہیں، برق کہیں تھے
دستانے کہیں، خود کہیں، فرق کہیں تھے

شیروں نے دل اس فوجِ بدآئین کے توڑے   گویا کہ پرے خیبر و صفین کے توڑے
ہاتھ آیا، تو بازو کسی بے دین کے توڑے   جھنجھلائے، تو لشکر کے نشاں چھین کے توڑے
چھینٹیں بھی اُدھر خون کی نہروں کی اڑائیں
کیا دھجیاں علموں کے پھریروں کی اڑائیں

سیدانیاں دروازے پہ تھیں کھولے ہوئے سر
اصغر کو لیے کانپتی تھی بانوے بے پر
فضّہ تھی پریشاں، کیے منھ خیمے کے باہر
پردے سے لگی کہتی تھیں یہ شاہ کی خواہر
"بتلا مجھے بچے مرے کیا کرتے ہیں دونوں"
وہ کہتی تھی "لاکھوں سے وغا کرتے ہیں دونوں

"وہ رُخ پہ نظر آتے ہیں اُڑتے ہوئے گیسو
وہ نیمچے بجلی کی طرح گرتے ہیں ہر سو
ڈھالیں لیے وہ بھاگتے پھرتے ہیں جفا جو
وہ ابر میں چھپ چھپ کے نکل آتے ہیں مہ رو
بہتا ہے لہو چھاتیوں سے، چور ہیں دونوں
کس طرح پکاروں، کہ بہت دور ہیں دونوں

"لاکھوں تو بلا میں ہیں، وہ بچے کسے ٹالیں
تلواریں اِدھر ہیں، تو اُدھر نیزوں کی بھالیں
زِرہوں پہ چار آئینے، نہ ہاتھوں میں ڈھالیں
مہلت نہیں سینوں سے جو تیروں کو نکالیں
"تلواروں میں بھائی کی سپر ہوتا ہے بھائی
بہتا ہے جو بھائی کا لہو، رُوتا ہے بھائی"

ڈوبے ہوئے تھے شام کے بادل میں وہ دو ماہ
پردے سے کھڑی تکتی تھیں زینب سوئے جنگ گاہ
عبّاس سے کہتے تھے تڑپ کر شہِ ذی جاہ
"اب مجھ سے جُدا ہوتے ہیں دو شیر مرے آہ
کیونکر متحمل ہو دل اس رنج و محن کا
گھر لُٹتا ہے بھائی! مری نادار بہن کا"

بڑھنے لگے میداں کی طرف قاسمِ ذی جاہ
اکبر نے یہ کی عرض "کہ میں جاتا ہوں یا شاہ!
ہو دونوں کی فرقت کا مجھے صدمۂ جاں کاہ
لاکھوں میں ہیں تنہا پھپھی امّاں کے پسر آہ!
ریتی پہ کہیں گر نہ پڑیں برچھیاں کھا کر
میں ساتھ انھیں لے آتا ہوں اعدا کو بھگا کر"

عباس نے کی عرض، کلیجا ہے دو پارا   اُن کو تو کسی کی نہیں امداد گوارا
زخمی ہوئے نہ مجھ کو، نہ اکبر کو پکارا   جائیے یہ غلام، آپ جو فرمائیں اشارا
حضرت کی قسم دے کے میں سمجھاؤں گا اُن کو
زخمی ہیں، میں گودی میں اُٹھا لاؤں گا اُن کو"

حضرت نے کہا "صاحبِ غیرت ہیں وہ دونوں   لختِ جگرِ شاہِ ولایت ہیں وہ دونوں
ضرغامِ نیستانِ شجاعت ہیں وہ دونوں   واللہ بڑے صاحبِ ہمت ہیں وہ دونوں
دو لاکھ تو کیا ہیں، جو کروروں میں گھریں گے
بے جان دیے وہ نہ پھرے ہیں، نہ پھریں گے"

یہ ذکر تھا، جو طبل بجا فتح کا ناگاہ   چلائے حرم "لُٹ گئی بنتِ اسد اللہ"
سجدے کو سوئے قبلہ جھکیں زینبِ ذی جاہ   دوڑے طرفِ دشتِ وغا روتے ہوئے شاہ
تلواریں علم قاسم و عباس لیے تھے
ہم شکلِ نبی چاک گریباں کیے تھے

ماں کا صبر   ہو ہو کا جو اک شور ہوا رانڈوں میں برپا   زینب بھی ہٹیں چھوڑ کے دروازے کا پردا
چلائیں، "ارے چپ رہو، یہ شور ہے کیسا؟   بھائی ہیں سلامت، مجھے کیوں دیتے ہو پرسا
ہو ہو نہ کرو صاحبو! گھبرائیں گے شبیر
پھر کون ہے زینب کا، جو مر جائیں گے شبیر

"بیٹوں سے ہوئی گر تو ہوئی آج جدائی   سر پر مرے دنیا میں سلامت ہیں بھائی
اک دولتِ اولاد لُٹائی تو لُٹائی   کیا لُٹ گیا، وہ کون سی ایسی تھی کمائی
کیوں روؤں میں، دنیا میں جو دلبند نہیں ہیں
کیا اکبر و صغر مرے فرزند نہیں ہیں؟

"سرہانے نہ کھولو، کہ مجھے آتا ہے وسواس — اِک شب کی دُلھن گھر میں ہے، اُس کا بھی نہیں پاس
شبیر تو سر پر ہیں، جو بیٹوں سے ہوئی یاس — اکبر مری اُمید ہے، قاسم ہے مری آس
اَب خلد میں دادی کے قریں جائیں گے دونوں
کیا پیٹنے رونے سے چلے آئیں گے دونوں؟"

باتیں یہ کہیں سب سے، پہ سنبھلا نہ دلِ زار — تڑپا یہ کلیجا، کہ گریں خاک پہ اک بار
واں لاشوں پہ روتے ہوئے پہنچے شہِ ابرار — جہاں کوئی ساعت کے لیے وہ جگر افگار
کس عمر میں ہستی کا چمن چھوڑ رہے تھے!
گودی کے پلے خاک پہ دَم توڑ رہے تھے

لاشوں کو شہِ دیں صفِ ماتم پہ جو لائے — سب اہلِ حرم پیٹتے روتے ہوئے آئے
زینب نے نہ فریاد کی، نہ اشک بہائے — بیٹھی رہیں سر زانوئے اقدس پہ جھکائے
لب خشک تھے، مُنھ زرد، مژہ اشکوں سے تر تھی
نہ اپنی، نہ بھائی کی، نہ لاشوں کی خبر تھی

بانو جو قریب آئیں، تو یہ بولی وہ مغموم — "بی بی! مجھے کچھ آنکھوں سے ہوتا نہیں معلوم
کس جا علی اکبر ہیں؟ کدھر ہیں شہِ مظلوم؟ — کس کی خبر آئی ہے، کہ ماتم کی ہے یہ دھوم؟
پردیس میں جینے سے کِسے یاس ہوئی ہے؟
یہ کون سی ماں بیٹوں سے بے آس ہوئی ہے؟

"عرصہ ہوا بچوں کو مرے رن میں سدھارے — کیا جانیے، سر ماموں پہ وارے کہ نہ وارے
دھڑکا ہے، کہ کمسن ہیں بہت وہ مرے پیارے — دریا پہ کہیں جا نہ پڑیں پیاس کے مارے
سر دے کے پھریں، دھوم ہو ثابت قدمی کی
میں دودھ نہ بخشوں گی، جو لڑنے میں کمی کی"

بولے یہ بصد درد علی اکبرِ ذی شاں　　"حاضر ہے یہ محجوب غلام، اے پھپھی اماں!"
شبیر پکارے کہ "بہن! میں ترے قرباں　　زندہ تھا سحر تک، مگر اب میں ہوا بے جاں

فوجوں کو بھگایا ہے، ہزاروں سے لڑے ہیں
یہ عون و محمد ہیں جو بے جان پڑے ہیں"

ہوش آ گیا زینب کو صدا بھائی کی سُن کر　　کی عرض "یہ سب آپ کا صدقہ ہے، برادر!
خوشنود ہیں آقا، تو رضامند ہے مادر　　لو بخش دیا دودھ انھیں، یا شہِ صفدر!

یہ آپ پہ قربان ہوئے راہِ خدا میں
نام ان کے خدا عرش پہ لکھے شہدا میں"

پھر عرض یہ کی "مجھ سے یہ فرمائیے یا شاہ!　　کس طرح لڑے دونوں غلامانِ ہوا خواہ"
حضرت نے کہا "مدح میں قاصر ہے زباں آہ!　　زینب! مجھے یاد آ گئی جنگِ اسد اللہ

صفین و جمل میں بھی کبھی رن ایسے نہ پڑے تھے
تم پوچھ لو عباس تو نزدیک کھڑے تھے"

عباس نے کی عرض "زباں لاؤں کہاں سے　　جو کر گئے یہ لال، وہ باہر ہے بیاں سے
لڑتے تھے اسی طرح علی فوجِ گراں سے　　افسوس! کہ یوں اُٹھ گئے یہ شیرِ جہاں سے

تلواریں جب اُن کی مجھے یاد آتی ہیں بھینا
دو بجلیاں آنکھوں میں چمک جاتی ہیں بھینا

"کیا عرض کروں عون و محمد کی لڑائی!　　گویا کہ یہ دیکھے ہوئے تھے جد کی لڑائی
بس صاف تھی صفین کی سرحد کی لڑائی　　غل تھا کہ یہ ہے بازوئے احمد کی لڑائی

جو رن پہ چڑھا ہو، وہی جانے کہ یہ کیا تھا
دُنیا میں علی آج جو ہوتے، تو مزا تھا"

یہ سُنتے ہی سُرخی سی رُخِ زرد پہ آئی   حضرت سے کہا "آپ کا صدقہ ہو یہ بھائی!   ماں کی خوشی
کونین میں عزّت مرے دلبندوں نے پائی   اب شاد ہوئی ان سے یداللہ کی جائی
آقا مجھے پیار آتا ہو اقبال پہ ان کے
بے کس ہیں، خدا رحم کرے حال پہ ان کے"

حضرت نے کہا "رو لو گلے اِن کو لگا کر   اب پاس تمھارے یہ نہیں آئیں گے جا کر
پانی نہ پیا نزع میں بھی برچھیاں کھا کر   رخصت ہوئے ماموں کو لبِ خشک دکھا کر
کس سے کہوں، کیسے یہ وفادار پسر تھے
دم نکلے، تو دونوں کے مرے پاؤں پہ سر تھے"

بانو نے رکھے زانوئے زینب پہ سر اُن کے   جو بیبیاں تھیں، آ گئیں منھ کو جگر اُن کے
زینب نے جو کی جھک کے رخوں پر نظر اُن کے   دکھلائی دیے چاند سے مُنھ خوں میں تر اُن کے
رخسار بھی مجروح تھے، ابرو بھی کٹے تھے
شانے تھے جدا، چاند سے بازو بھی کٹے تھے

مُنھ چھاتیوں پر رکھ کے یہ ناشاد پکاری   "آرام میں ہو، یا ہو غشی پیاس سے طاری   بہادر ماں کے بین
ہوتا ہو بیاں شوکت و ہمت کا تمھاری   تسلیمیں کرو قبلۂ کونین کو واری
سمجھی میں، کہ باعث ہو یہ بیداریِ شب کا
پیارو! یہ طریقہ نہیں اربابِ اَدب کا

"تعریفِ امام دوسرا کرتے ہیں، اُٹھو   عبّاسِ علم دار ثنا کرتے ہیں، اُٹھو
ہم شکلِ نبی مدح و ثنا کرتے ہیں، اٹھو   سب لوگ نہ اُٹھنے کا گلا کرتے ہیں، اُٹھو
آقا سے مصیبت میں جُدا ہو نہیں جاتے
صدقے گئی، یوں جنگ کے دن سو نہیں جاتے

"حضرت کو لڑائی کے پیام آتے ہیں، اُٹھو — خیمے کی طرف ساکنِ شام آتے ہیں، اُٹھو
لو تیرِ ستم سوے امام آتے ہیں، اُٹھو — جرّار بُرے وقت میں کام آتے ہیں، اُٹھو
جلدی سے قباؤں کو پہنتے ہوئے نکلو
شمشیر و سپر تھام کے تنتے ہوئے نکلو

"جنگل میں قیام آج کہاں ہوگا، بتاؤ — ماں صدقے، مقام آج کہاں ہوگا، بتاؤ
دن تم کو تمام آج کہاں ہوگا، بتاؤ — بستر سرِ شام آج کہاں ہوگا، بتاؤ
ہموار زمیں شب کے بچھونے کو ملے گی؟
کیسی ہے جگہ جو تمھیں سونے کو ملے گی؟

"تاریکی میں واری تمھیں نیند آئے گی کیونکر؟ — شب ہوگی، تو بچوں کو یہ ماں پائے گی کیونکر؟
مادرِ دلِ بیتاب کو سمجھائے گی کیونکر؟ — واں تک مرے رونے کی صدا جائے گی کیونکر؟
نکلوں جو تجسس میں، تو بے جا نہیں واری
ماں ہوں، مرا پتھر کا کلیجا نہیں واری

"اب زیست سے اماں کا بھی دل سیر ہے پیارو! — جیتی ہوں، یہ قسمت کا مری پھیر ہے پیارو!
تم مر گئے، دنیا مجھے اندھیر ہے پیارو! — کیا جانے مری موت میں کیا دیر ہے پیارو!
ہے کون سی دولت جسے کھونے کو رہی ہوں؟
معلوم نہیں اب کسے رونے کو رہی ہوں"

ٹکڑے تھے کلیجے یہ بیاں درد کے سن کر — اک حشر تھا، سیدانیاں سب پیٹتی تھیں سر
بانو نے کہا قبلۂ کونین سے اُٹھ کر — "مر جائے گی ماں، لاشوں کو لے جائیے باہر
فرزند کا غم خالقِ عالم نہ دکھائے
اللہ کسی ماں کو یہ ماتم نہ دکھائے"

قاسمِ نوشاہ کا جہاد

شاعرانہ تعلی

ہے گوہرِ محیطِ فصاحت سخن مرا
گویا ہے موتیوں کا خزانہ دہن مرا
ہے مدح خوانی گلِ زہرا چلن مرا
محفوظ ہے جہاں میں خزاں سے چمن مرا
بلبل نے ایسے نغمۂ رنگیں سُنے نہیں
دامن میں ہیں وہ گُل جو کسی نے چُنے نہیں

ہر جا ہے ملکِ نظم میں نظم و نسق مرا
کہتے ہیں انتظام جسے ہے وہ حق مرا
ہے سہل ممتنع یہ کلام ادق مرا
برسوں پڑھیں تو یاد نہ ہووے سبق مرا
پائی نہیں کبھی یہ حلاوت نبات میں
مضمونِ نو ٹپک رہے ہیں بات بات میں

فوجِ سخن میں شقہ کشا ہے علَم مرا
بڑھتا ہے سب سے مدح میں بڑھ کر قدم مرا
ڈنکا بجے جہاں میں نہ کیوں دم بدم مرا
ہے معرکے میں رستمِ دستاں قلم مرا
نقشہ جو کھینچنا ہے صفِ کارزار کا
خامہ دکھا رہا ہے چلن ذوالفقار کا

قاسم کی تصویر

مشتاقِ اذنِ جنگ ہے قاسم سا سیم بر
روشن ہیں جس کے چہرۂ انور سے دشت و در
کم سن اگرچہ ہے ابھی وہ غیرتِ قمر
تن تن کے جھومتا ہے مگر مثلِ شیرِ نر
جرأت نثار ہوتی ہے اس سرفروش پر
شملہ چھٹا ہے سبز عمامے کا دوش پر

تلوار تول تول کے دستِ حنائی میں
کہتے ہیں خوں بہائیں گے ہم اس لڑائی میں
حاصل ہو ہاتھ کو یدِ بیضا صفائی میں
اختر کی ضو دکھاتا ہو کنگنا کلائی میں
ساعد فروغ دیتے ہیں تارِ نگاہ کو
دکھلاتی ہیں ہتھیلیاں آئینہ ماہ کو

وہ باغ عمرِ قاسم نوشاہ کی بہار!
سنبل سی زلفیں، سرو سا قد، پھول سے عذار
آنکھیں وہ، جن پہ کیجیے نرگس کو بھی نثار
نازک لب اس قدر، رگِ گل جن کے آگے خار
گیسو ملے ہوا سے، تو جنگل مہک گئے
جب ہنس کے بات کی، تو ستارے چمک گئے

کچھ حسن بچپنے کا، تو کچھ آمدِ شباب
وہ گل سا جسم اور وہ چہرے کی آب و تاب
اپنی جگہ پہ خال کے نقطے ہیں انتخاب
پُتلی کا نور جن کی سیاہی سے بہرہ یاب
گردن کی ضو میں طورِ تجلّی طور کے
سب عضوِ تن ڈھلے ہوئے سانچے میں نور کے

گھر بے چراغ ہو گیا بنتِ علی کا جب
غیرت کا جوش آگیا قاسم کی ماں کو تب
مَل مَل کے ہاتھ کہتی تھی دل سے کہ ہے غضب
ہم شکلِ مصطفےٰ کہیں مرنے نہ جائے اب
اولاد اپنی آج کے دن گر بچاؤں گی
میں فاطمہ کو حشر میں کیا منھ دکھاؤں گی

ماں کا جنگ پر آمادہ کرنا

دل میں یہ سوچتی ہوئی اٹھی وہ خوش خصال
قاسم کو اپنے پاس بلایا بصد ملال
رو کر کہا کہ "اے حسنِ مجتبےٰ کے لال!
کچھ اس ضعیف ماں کی بھی عزت کا ہے خیال؟
جاری ہیں اشکِ خوں مری چشمِ پر آب سے
زینب کے آگے جا نہیں سکتی حجاب سے

"سب مر چکے امامِ دو عالم کے اقربا
باقی ہے کون اکبر و عباس کے سوا
حضرت کے تن کی جان ہیں وہ دونوں مہ لقا
سر ان کے کٹ گئے، تو قیامت ہوئی بپا
تم بھی خجل رہو گے سدا جد کے سامنے
شرمائیں گے حسنؑ بھی محمدؐ کے سامنے

"جو مرد ہیں وہ دیتے ہیں مردانگی کی داد
کچھ اپنے باپ کی بھی وصیت ہے تم کو یاد؟
جلدی دولھن سے مل کے سدھارو پئے جہاد
قربان ہو چچا پہ، یہی ماں کی ہے مراد
بیاہا تمھیں، بر آئی ہر اک آرزو مری
اب وہ کرو، کہ جس سے رہے آبرو مری"

مادر کے مُنھ کو دیکھ کے بولا وہ گل عذار
"ایسے ہیں ہم، کہ بیٹھ رہیں وقتِ کارزار؟
جانیں ہزار ہوں تو چچا پر کریں نثار
رخصت ہے وہ نہ دیں تو ہے کیا اپنا اختیار
رن میں چلے تھے مرنے کو پہلے ہی سب سے ہم
رُوکا چچا نے، کہہ نہ سکے کچھ ادب سے ہم"

دولھن سے رخصت

یہ کہہ کے آئے سر کو جھکائے دُولھن کے پاس
آنکھوں میں اشک، درد کلیجے میں، جی اُداس
فرمایا "ہم کو ہائے یہ شادی نہ آئی راس
سب مر گئے عزیزِ شہنشاہِ حق شناس
بستی تمام لٹ گئی، ویرانہ ہو گیا
شادی کا گھر جو تھا، وہ عزا خانہ ہو گیا

"کس سے کہیں جو حالِ دلِ دردناک ہے
تلوار چل رہی ہے، جگر چاک چاک ہے
اس زندگی پہ حیف ہے، دُنیا پہ خاک ہے
اب کوئی دم میں دلبرِ زہرا ہلاک ہے
آئی تباہی آلِ نبی کے جہاز پر
نرغہ ہے شامیوں کا امامِ حجاز پر

"تم بھی کچھ اپنے باپ کی اس دم کرو مدد
آفت میں آج ہو پسرِ ضیغمِ صمد
دشمن کو بھی خدا نہ دکھائے یہ روزِ بد
صدقے کرو ہمیں، کہ بلا اُن کی ہوئے رد
راضی رضائے حق پہ بصد آرزو رہو
حیدر سے ہم بتول سے تم سرخ رو رہو

"سوچو تمہیں، گلا نہ کٹائیں، تو کیا کریں
فریادِ فاطمہ کی صدائیں سُنا کریں؟
رخصت کرو، تو فوجِ ستم سے وغا کریں
کھولو جو لعلِ لب، تو گھر ہم فدا کریں
صاحب! ہمیں سپردِ عروسِ اجل کرو
مشکل کشا کی بیٹی ہو، مشکل کو حل کرو

"گھونگھٹ ہٹا کے ہم کو دکھاؤ تو رُخ کا نور
پاس اب نہ آسکیں گے، کہ ہوتے ہیں تم سے دور
آنکھوں پہ ہیں ہتھیلیاں، رقت کا ہے وفور
نرگس کے پھول ہاتھوں سے ملنا، یہ کیا ضرور
جینے کی اس چمن میں خوشی دل سے فوت ہے
بُلبُل جو گُل کی شکل نہ دیکھے، تو موت ہے

"صاحب! بھلا عدم کے مسافر سے کیا حجاب
ہم یوں ہیں جس طرح سے سرِ آب ہو حباب
ایسی روا روی میں ٹھہرنے کی کب ہے تاب
کہتی ہے موت، گور کی جانب چلو شتاب
رستہ ہے پُر خطر، کہیں وقفہ ذرا نہ ہو
منزل بہت کڑی ہے یہ جلدی رَوا نہ ہو

"اِک دم کی بھی ہمیں تو جدائی ہے تم سے شاق
کیا کیجیے، نصیب میں ہے صدمۂ فراق
لائی اجل پکڑ کے گریباں سوئے عراق
بولو زباں سے کچھ، کہ نہ رہ جائے اشتیاق
چپکی یونہی رہو گی تنِ پاش پاش پر؟
کیا بین بھی کرو گی نہ دولہا کی لاش پر؟"

جب یہ سُنے کلام، تو جی سنسنا گیا
دل پر چھری چلی، کہ جگر تھرتھرا گیا
مُنھ پر دولھن کے صاف رنڈاپا سا چھا گیا
جوشِ بکا میں کچھ نہ زباں سے کہا گیا
دُولھا کو اتنی بات سُنا کر اِک آہ کی
"صورت بتاتے جاؤ ہمارے نباہ کی

"سمجھی، کہ جیتے اب نہیں پھرنے کے رَن سے تم
پیاسا گلا کٹا کے ملوگے حسن سے تم
سوؤگے مُنھ چھپا کے لحد میں کفن سے تم
اچھا سلوک کرتے ہو صاحب! دلھن سے تم
اک رات کی بنی پہ جفا یوں ہی چاہیے!
اَے شمعِ بزمِ مہر و وفا! یوں ہی چاہیے!"

باتیں یہ سُن کے روتے تھے قاسم بحالِ زار
ھَل مِن مُبارِز کی صدا آئی ایک بار
ماں نے کیا اشارہ کہ "اَے میرے گل عذار!
موقع نہیں ہے دیر کا، اُٹھو یہ ماں نثار
کیا جانے ہوگا قبر میں کیا حال باپ کا
جی لگ گیا عروس کی باتوں میں آپ کا"

فرما کے اَلوداع اُٹھا دلبرِ حسن
برہم ہوئی وہ بزم، وہ صحبت، وہ انجمن
غُل پڑ گیا کہ لٹتی ہے اک رات کی دولھن
اُس وقت سب سے دولھا کی ماں کا تھا یہ سخن
"جاتی ہے اب برات مرے نونہال کی
رخصت ہے بیبیو! زنِ بیوہ کے لال کی"

امام حسین سے رخصت

سب سے وداع ہو کے جو نکلا حسن کا لال
دیکھا، کہ در پہ روتے ہیں سرور بصد ملال
بس گر پڑا قدم پہ یہ کہہ کر وہ خوش خصال
"دیجے رضائے جنگ، مجھے بہرِ ذوالجلال"
چلّائی ماں کہ "سبطِ پیمبر! نہ روکیو"
شبّر نے دی صدا کہ "برادر! نہ روکیو"

لپٹا کے اُس کو چھاتی سے بولے شہِ اُمم — "پیارے! تمھارا داغ بھی دل پر سہیں گے ہم
یہ پیش و پس ہے منزلِ ہستی میں کوئی دم — تم آگے چند گام، تو ہم پیچھے دو قدم
کچھ غم نہیں، جو راہ ہے خنجر کی دھار پر
ہر دم خدا کا فضل ہے اس خاکسار پر"

یہ کہہ کے دل قلق سے بھر آیا جو ایک بار — رُوئے مثالِ ابر شہِ آسماں وقار
تر آنسوؤں سے ہو گئی ریشِ خضاب دار — تسلیم کر کے قاسمِ گل رُو ہوئے سوار
دولھا کے نورِ رُخ کی ضیا دور تک گئی
جولاں کیا فرس کو، تو بجلی چمک گئی

وہ شہسوار، اور وہ سمندِ فلک نورد — پائی کبھی صبا نے نہ جس کے قدم کی گرد
بازارِ برق گرم روی سے تھا اس کی سرد — یوں چال میں پری، تو چھلاوہ وہ دم نبرد
اس کی سُبک روی سے خجالت سحاب کو
دریا پہ جائے، اور نہ خبر ہو حباب کو

گھوڑے کی تعریف

گھوڑا کہیں، پرند کسی ہما، پری کہیں — آہو کہیں، ہما کہیں، کبکِ دری کہیں
تیروں نے اُس سے رو میں نہ کی ہمسری کہیں — نرمی کہیں، شتاب کہیں، صفدری کہیں
رکھتا تھا معرکے میں قدم اس وقار سے
جیسے چمن میں پھول گریں شاخسار سے

دونوں کنوتیاں ہیں، کہ پیکان تیر ہیں — چاروں سُم اُس کے غیرتِ بدرِ منیر ہیں
آنکھوں پہ کھنچے جو نظر، بے نظیر ہیں — یال ایسی، جس کے پیچ میں پریاں اسیر ہیں
سُرعت میں اُس سے طیر کو نسبت، نہ تیر کو
نرمی یہ جلد میں، کہ خجالت حریر کو

آنکھیں وہ، جن کو دیکھ کے حیران ہے غزال گردن وہ، جس کی شرم سے ہے سرنگوں ہلال
آہو کی جست، شیر کی چتون، پری کی چال دل اُس کے دست و پائے حنائی سے پائمال
ہر نعلِ پا کا حُسن یہ تھا اُس جلوس میں
آئینہ جس طرح سے ہو دستِ عروس میں

اللہ ری نبیرۂ مشکل کشا کی شان! تھی جس کے عضو عضو سے پیدا خدا کی شان
حیراں تھے لوگ دیکھ کے اُس مہ لقا کی شان حمزہ کا رعب، زورِ علی، مصطفا کی شان
پاکیزگی نسب میں، بزرگی صفات میں
شیرینیِ کلامِ حسن بات بات میں

سب دیکھتے تھے شوکتِ بختِ دلِ حسن عمامہ سر پہ، خلعتِ شاہانہ زیبِ تن
جنگ آزما، نہنگِ وغا، شیرِ صف شکن ناشاد و نامراد، اسیرِ غم و محن
حُسنِ حسن کی چہرۂ انور میں شان تھی
قالب تھا رزم گاہ میں، خیمے میں جان تھی

پہنچا جو رزم گاہ میں وہ غیرتِ قمر نیزہ پکڑ کے گھوڑے کو پھیرا اِدھر اُدھر آمد
بولے عدو، یہ کوئی فرشتہ ہے یا بشر؟ خورشید خاوری کی بھی خیرہ ہے یاں نظر
اللہ ری چمک رُخ پہ آب و تاب کی
سہرا بنا ہوا ہے کرن آفتاب کی

بڑھ کر رجز یہ پڑھنے لگے قاسمِ جری "عالم میں کون ہے، جو کرے ہم سے ہمسری؟ رجز
ہم حیدری ہیں، ہم میں ہے زورِ غضنفری ہم سے ہے اوجِ پایۂ اورنگِ صفدری
شہرہ ہے جس سے حضرتِ شبّر خاص و عام کا
سکّہ ہے شش جہت میں ہمارے ہی نام کا

"جد ہی مرا امیرِ عرب، شحنۂ نجف — ضرغامِ دیں، معینِ رسولانِ سلف
دادی جنابِ فاطمہ زہرا سی ذی شرف — عمو حسین، صاحبِ لولاک کا خلف
میں پارۂ دلِ حسنِ خوش خصال ہوں
ہے سر سے جو شہید ہوا اُس کا لال ہوں"

اللہ رے ہیبتِ رجز خوانیِ ہزبر! — جھنجھلا کے گونجتا ہو نیستاں میں جیسے ببر
چھائی ہوئی ہو فوجِ ضلالت مثالِ ابر — جو من چلے ہیں فوج میں، بڑھتا ہو اُن پہ جبر
لہجے سے سب علی کا جلال آشکار ہو
نقرہ ہر اک رجز کا نہیں، ذوالفقار ہو

جنگ

پڑھ کر رجز کمر میں رکھی اسپ کی لجام — بھرنے لگا نظر کے اشاروں پہ خوش خرام
سرعت، وہ رخش کی، وہ درخشانی حسام — اک برق کوندتی تھی میانِ سپاہِ شام
دلدل کی چال جو، وہ چلن بادپا کا تھا
بجلی کی تھی جو تیغ، تو گھوڑا ہوا کا تھا

ناگاہ فوجِ شام سے تیرِ ستم چلے — تیغ و سنان و نیزہ و خنجر بہم چلے
قاسم بھی یاں سے کھینچ کے تیغ دودم چلے — اعدا پہ چھیڑ کر فرسِ خوش قدم چلے
پیدل تو اُس قطار کے تھے کس شمار میں
دو دو سوار کٹ گئے ایک ایک وار میں

ڈھالیں اُٹھیں، کہ دن شبِ دیجور ہو گیا — لامع جو برقِ تیغ ہوئی، نور ہو گیا
حیراں ہر ایک ظالمِ مقہور ہو گیا — چہروں کا رنگ خوف سے کافور ہو گیا
آئی ہنسی اجل کو بھی، اس طرح مر گئے
گھوڑوں پہ تن چڑھے رہے، اور سر اُتر گئے

وہ تیغ جب بڑھی، صفِ کفّار ہٹ گئی — چمکی جو برق ڈھالوں کی بدلی سمٹ گئی
دم بھر میں یوں صفوں کو اُلٹ کر پلٹ گئی — رَن کی زمیں لہو کے ڈریڑوں سے کٹ گئی
دریا بھی آبِ تیغ سے بے آبرو ہوا
غل تھا، کہ لو فرات کا پانی لہو ہوا

برسا رہی تھی دشت میں وہ شعلہ رو لہو — شبّر کا لال بیچ میں تھا، چار سو لہو
تا سینہ اِس طرف، تو اُدھر تا گلو لہو — کوسوں تھا سرزمین عرب میں لہو لہو
بہتا تھا خوں زمیں پہ جو اہلِ خلاف کا
فرطِ خوشی سے سُرخ تھا چہرہ مصاف کا

نیزوں کے بند بند قلم، برچھیاں دونیم — مثلِ قلم زبانِ درازِ سناں دونیم
چار آئینے کٹے ہوئے، گُرزِ گراں دونیم — مغفر سے تا کمر جسدِ پہلواں دونیم
سالم تھا بیشِ آئینۂ تیغ جو نہ تھا
لشکر میں کون سا تھا وہ یکتا، جو دو نہ تھا

تھا ابنِ سعد شوم کو اس دم بہت ہراس — غرقِ سلاح ازرقِ شامی کھڑا تھا پاس
اُس سے کہا کہ "فوج نہایت ہے بے حواس — تو جا کے لڑ تو قتل ہو شاید یہ حق شناس
رُکتا ہی برچھیوں سے، نہ دامِ کمند سے
جلدی سناں پہ اس کو اٹھا لے سمند سے"

کہنے لگا بگڑ کے وہ باصد غرور و لاف — "تو آپ بے حواس ہے، تقصیر ہو معاف
یہ امر، اے امیر! شجاعت کے ہے خلاف — ہاں تب لڑوں، علی اگر آئیں پئے مصاف
فرق آئے گا کبھی نہ مری آن بان میں
لڑکے سے لڑ کے نام مٹا دوں جہان میں؟"

ازرق شامی کی لاف زنی

"ڈرتے ہیں سب جری مری جنگ و جدال سے / رستم کا زور آگے مرے کم ہے زال سے
رکتی نہیں یہ تیغ تہمتن کی ڈھال سے / ناداں ہوں کیا، لڑوں میں جو اس خرد سال سے
بیٹوں کو میرے بھیج، کہ چاروں دلیر ہیں
جنگ آزما ہیں، شور ہیں، صفدر ہیں، شیر ہیں"

کیا بد نہاد تھے پسرِ ازرقِ پلید! / دشمن تو آلِ پاک کے، شیطان کے مرید
بولا یہ اُن کو دیکھ کے وہ پیرِ یزید / "ہاں جا کے اس یتیم کو جلدی کرو شہید
رُلواؤ قبر میں حسنِ دل ملول کو
بیوہ بنا دو دخترِ سبطِ رسول کو

"یہ چاند مجتبیٰ کا ہے خوں میں اسے ڈباؤ / تلواریں مارو، ذبح کرو، برچھیاں لگاؤ
انعام دوں، یہ جنگ اگر فتح کر کے آؤ / سہرے سمیت کاٹ کے دولھا کے سر کو لاؤ
خلعت ملیں گے، جاؤ گے جب دم سلام کو
مرِ اس کا نذر دیجو تمھیں میرِ شام کو"

ازرق کے چار بیٹوں سے جنگ

نکلا یہ بات سنتے ہی اُن میں سے ایک پیل / پیچھے چلی شریر کے ہنستی ہوئی اجل
نعرہ کیا یہ غیظ سے موذی نے کھا کے بل / "ہاں اے حسن کے لال! خبردار ہو سنبھل
کام آئے کچھ، تو نامِ شہِ ذوالفقار لے
پُشتی پہ ہو کوئی، تو مدد کو پکار لے"

قاسم یہ نعرہ زن ہوئے چمکا کے ذوالفقار / "امداد وقتِ جنگ ہے شیروں کو ناگوار
کافی ہے بس ہمیں سپرِ حفظِ کردگار / او خیرہ سر! اجل تری گردن پہ ہے سوار
دشمن کو اپنی ضرب طمانچہ قضا کا ہے
آ کوئی وار کر، جو ارادہ وغا کا ہے"

یہ سنتے ہی کماں کو اُٹھا کر بڑھا شریر — چلّے میں تین بھال کا جوڑا شقی نے تیر
تھا بس کہ تیز دستِ حسنؑ کا مہِ منیر — بجلی سی آئی کوند کے شمشیرِ بے نظیر
یوں قطع انگلیاں ہوئیں اُس تیرہ بخت کی
جیسے کوئی قلم کرے شاخیں درخت کی

اک ہاتھ میں جو کٹ کے گرے دستِ نابکار — بولے کمر میں رکھ کے یہ شمشیرِ آب دار
"اب دیکھ میرے تیر کا توڑ اے خطا شعار!" — پکڑا کماں کے قبضے کو، یہ کہہ کے اسوار
چلّہ جو کھینچنے لگے سرکش کو تاک کے
رستم کی روح چھپ گئی تودے میں خاک کے

چٹکی سے چھوٹ کر جو چلا تیرِ بے اماں — قربان تیرے ہاتھ کے، چلّائی یہ کماں
بچتی ہی کب خدنگِ اجل سے کسی کی جاں — نکلا وہ تیر توڑ کے سینے کے استخواں
اک دم میں دی شکست خطا کو صواب نے
غل تھا، قفس کی تیلیاں توڑیں عقاب نے

مرکب سے گر کے مر گیا جب وہ عدوئے دیں — نکلا اُدھر سے تب پسرِ ثانیِ لعیں
نیزے کو تولتا ہوا مغرور و خشمگیں — ابرو پہ بل، نگاہ میں قہر، اور جبیں پہ چیں
ہمراہ اُس کے تیغ بکف سو سوار تھے
اور اس طرف مدد کو شہِ ذوالفقار تھے

نیزے کا وار کرنے لگا جب وہ خود پسند — بجلی سا کوندنے لگا دولھا کا بھی سمند
نیزہ اُڑا کے نیزے سے کی یہ صدا بلند — "کیوں تو نے دیکھے نیزۂ مشکل کشا کے بند؟"
یہ سن کے اُس نے ڈھال کو چہرے پہ کر لیا
پتلی کو بے حیا کی سناں میں پرو لیا

بیکار کور ہو کے ہوا جب وہ خیرہ سر　　پٹکے میں ہاتھ ڈال کے ٹیکا زمین پر
آواز دی زمیں نے کہ فی النار والسقر　　جا تو بھی، ہے برادرِ عیسیٰ ترا جدھر

جز موت کچھ شقی کو نہ اُس دم نظر پڑا
آنکھیں کھلیں، تو قعرِ جہنّم نظر پڑا

چھوٹا برادر سوم اُس کا بہ کرّ و فر　　تانے ہوئے وہ گرزِ گراں سر کہ الحذر
یاں بہر حفظ دست یداللہ تھے سپر　　تیغِ دو دم کو شیر نے تولا بچا کے سر

یوں دو کیا عمودِ سرِ نابکار کو
جس طرح تیغ تیز اُڑا دے خیار کو

مرتے ہی اُس کے، فوج سے چوتھا پسر بڑھا　　قاسم پکارے "او دلِ خود سر! کدھر بڑھا؟"
سنتے ہی یہ، وہ تیغِ دو دم کھینچ کر بڑھا　　جھنجھلا کے مجتبیٰ کا بھی لختِ جگر بڑھا

لڑتا وہ کیا، کہ تیرِ اجل کا نشانہ تھا
اِک ہاتھ میں نہ سر تھا، نہ بازو، نہ شانہ تھا

ازرق سے جنگ

چاروں پسر جو رن میں ہوئے قتل ایک بار　　ازرق کا دل ہوا صفتِ لالہ داغ دار
جوشِ غضب سے سرخ ہوئی چشمِ نابکار　　مثلِ تنور منہ سے نکلنے لگا بخار

جیبِ قبا کو مثلِ کفن پھاڑتا ہوا
نکلا پرے سے دیو سا چنگھاڑتا ہوا

شانے پہ تھی شقی کے وہ دو ڈانک کی کماں　　ارجن بھی جس سے سہم کے گوشے میں ہو نہاں
چار آئنہ وہ پہنے تھا بر میں کہ الاماں　　دب جائیں جس کے بوجھ سے رستم کے استخواں

کہتی تھی یہ زرہ بدنِ بد خصال میں
پکڑا ہے پیل مست کو لوہے کے جال میں

آمدِ شقی کی دیکھ کے گھبرا گئے امام
عباسِ نامور سے بہ حسرت کیا کلام
"لو بھائی جنگ ہو چکی، قصّہ ہوا تمام
آیا سوئے یتیمِ حسنؑ موت کا پیام
ہم شکلِ مصطفےٰ کو بُلا لو پکار کے
مانگو دُعا سروں سے عمامے اتار کے"

یہ کہہ کے قبلہ رو ہوئے سلطانِ کائنات
درگاہِ کبریا میں دعا کی اُٹھا کے ہات
"اے خالقِ زمین و زماں، ربِ پاک ذات!
ازرق کے ہاتھ سے مرے قاسم کو دے نجات
تو حافظِ جہاں ہے، کریم و رحیم ہے
یارب بچا اسے، کہ یہ لڑکا یتیم ہے"

فوجیں اِدھر دُعا کی چلیں سوئے آسماں
بل کھا کے اُس طرف یہ پکارا وہ بدزباں
"رستم بھی ہو، تو کھنچ نہیں سکتی مری کماں
جوشن کو توڑتا ہے مرا تیرِ بے اماں
ہے اُس کی فتح، ساتھ ہوں میں جس رئیس کے
سُرمہ کیا ہے دیو کو چٹکی میں پیس کے"

قاسم نے دی صدا کہ "بس اب کر زباں کو بند
اللہ کو غرور و تکبّر نہیں پسند
حق نے فروتنی سے کیا مجھ کو سربلند
نیزے کا بند باندھ کوئی، پھیر کر سمند
دیکھیں بلند کون ہے اور پست کون ہے
کھل جائے گا ابھی، کہ زبردست کون ہے"

نیزہ ہلا کے جانب قاسم بڑھا وہ پیل
دُولھا نے مُسکرا کے صدا دی "سنبھل سنبھل
گھوڑا نہ گر پڑے ترے لنگر سے مُنہ کے بل
تو ہے فرس پہ اور تری گردن پہ ہے اجل
ضیغم ہیں بیشۂ اسد ذوالجلال کے
کیجو سناں کا وار ذرا دیکھ بھال کے"

یہ کہہ کے اپنے چھوٹے سے نیزے کو دی تکاں   چمکی اَنی، تو برق پکاری کہ اَلاماں
اک بند باندھ کر جو فرس سے کہا کہ ہاں   ڈانڈ آئی ڈانڈ پہ، تو سناں سے لڑی سناں
بل کیا کرے، کہ زور ہی موذی کا گھٹ گیا
غل تھا، کہ اژدہے سے وہ افعی لپٹ گیا

قاسم نے زور سے جو اَنی پر رکھی اَنی   بھاگا شقی کے جسم سے زورِ تہمتنی
بگڑا جو ڈھنگ، جان پہ ظالم کی آ بنی   تھی اس سناں کی نوک، کہ ہیرے کی تھی کنی
اُڑ کر گری زمیں پہ سناں اس تکان سے
گرتا ہی جیسے تیر شہاب آسمان سے

جھنجھلا کے چوب نیزہ کو لایا وہ فرق پر   قاسم نے ڈانڈ ڈانڈ پہ ماری بچا کے سر
دو انگلیوں میں نیزۂ دشمن کو تھام کر   جھٹکا دیا، کہ جھک گئی گھوڑے کی بھی کمر
نیزہ بھی دب کے ٹوٹ گیا نابکار کا
دو انگلیوں سے کام لیا ذوالفقار کا

سنبھلا وہ بے شعور یہ جھٹکا اُٹھا کے جب   قبضے میں لی کمان کیانی بصد غضب
چلّے میں تیر جوڑ چکا جب وہ بے اَدب   تیوری چڑھائی قاسم نوشاہ نے بھی تب
تیر نگاہ سے وہ خطا کار ڈر گیا
کانپے یہ دونوں ہاتھ، کہ چلّہ اُتر گیا

بولا یہ مسکرا کے جگر گوشۂ حسن   "رُخ پھیریو نہ، او ستم ایجاد پیل تن!"
چلائے بڑھ کے حضرتِ عباسِ صف شکن   "کیا خوب تجھ کو یاد ہیں تیر افگنی کے فن
دیکھا ہمارے شیر کی چتون کو، شان کو؟
کیوں منہ اُتر گیا ہی، چڑھائے کمان کو"

دو سمت سے چلے جو ملامت کے اُس پہ تیر
چلایا تیغِ تیز علم کر کے وہ شریر
"ہاں اے حسنؑ کے لعلِ بدخشاں! بگیر"
نکلی چمک کے یاں سے بھی شمشیرِ بے نظیر
چمکا کے تیغِ تیز جو قاسمؑ سنبھل گئے
سمجھا جو کچھ، فرس کے بھی تیور بدل گئے

مانندِ شیر غیظ میں آیا وہ پیل تن
آنکھیں اُبل پڑیں صفتِ آہوے ختن
ماری زمیں پہ ٹاپ کہ لرزا تمام بن
چلائے سب کہ گھوڑے پہ بھی لو چڑھا ہے رن
میخیں زمیں کی اُس کی تگاپو سے ہل گئیں
دونوں کنوتیاں بھی کھڑی ہو کے مل گئیں

فر فر نفس کی آتی تھی نتھنوں سے جب صدا
کہتے تھے لوگ سب کہ ہے رفتار یہ باد پا
دشمن کو گھورتا تھا دہانا چبا چبا
غُل تھا کہ بس فرس ہو تو ایسا ہو باوفا
دشمن کو کیا نبرد میں بچنے کی آس ہو
لڑ لے کٹاریاں یہ فرس جس کے پاس ہو

دونوں طرف سے چلنے لگے وار یک بیک
دو بجلیاں دکھانے لگیں ایک جا چمک
تکنے لگے فلک کے دریچوں سے سب ملک
اک زلزلہ تھا اوجِ ثریا سے تا سمک
چہرے پہ آفتاب کے مقتل کی گرد تھی
یہ خوف تھا، کہ دھوپ کی رنگت بھی زرد تھی

ہر بار جانبین سے ہوتے تھے وار رد
تھا حرب و ضرب میں وہ شقی بھی بلائے بد
جب بڑھ کے وار کرتا تھا وہ بانیِ حسد
کہتا تھا بازوے شہ دیں "یا علی مدد"
یوں روکتے تھے ڈھال پہ تیغِ جہول کو
جس طرح روک لے کوئی شہ زور پھول کو

لایا جو حرفِ سخت زباں پر وہ بد خصال جھپٹا مثالِ شیرِ درندہ حسن کا لال
گھوڑے سے بس ملا دیا گھوڑا بصد جلال اتنے بڑھے کہ لڑ گئی اس کی سپر سے ڈھال

ادھڑ لگی، کہ ہوش اُڑے خود پسند کے
گھوڑے نے پاؤں رکھ دیے سر پر سمند کے

عباس نامدار نے پہلو سے دی صدا "ہاں اب جانے دیجیو! احسنت! مرحبا!
دشمن کے مار ڈالنے کی بس یہی ہے جا" سنتے ہی یہ فرس کو فرس سے کیا جدا

گھوڑا ابھی اِس طرف کو اُدھر مڑ کے پھر پڑا
مارا کمر کا ہاتھ کہ دو ہو کے گر پڑا

غازی نے دی صدا کہ "مبارک تمھیں ظفر" تسلیم کی چچا کو ادب سے جھکا کے سر
اور عرض کی یہ دور سے ہاتھوں کو جوڑ کر "اقبال آپ کا، کہ ہم ہو گئی یہ سر

پُشتی پہ آپ جب ہوں، تو پھر کیا ہراس ہو
کام آئے کیوں نہ راس جو اُستاد پاس ہو"

شہادت

عباس نامدار تو رن سے چلے اُدھر یعنی خوشی کی جا کے شہِ دیں کو دیں خبر
اس غم کدے میں دہر کے شادی کہاں مگر یاں اُس جری پہ ٹوٹ پڑے لاکھ اہلِ شر

لاکھوں سے لڑ کے پیاس سے مجبور ہو گئے
حربے ہزار ہا جو چلے، چور ہو گئے

کیونکر تمام فوج سے اک تشنہ لب لڑے ایک اک لڑا نہ آہ، بہم ہو کے سب لڑے
کھا کھا کے زخم مثلِ امیرِ عرب لڑے جاں بازیاں ستم کی دکھائیں، غضب لڑے

جلوہ میانِ تشنہ دہانی دکھا دیا
بچپن میں لڑ کے زورِ جوانی دکھا دیا

للکارا جس نے، بن میں گھوڑا ڈپٹ کے آئے
یوں آئے جیسے شیر درندہ جھپٹ کے آئے
بجلی گری اُدھر یہ جدھر کو پلٹ کے آئے
صف کو بچھا کے آئے، پرے کو اُلٹ کے آئے
مُنہ سُرخ تھا، کھلے ہوئے تھے زخم سینے کے
بن کر لہو ٹپکتے تھے قطرے پسینے کے

کاٹے رسالے، تیغ سے کارِ قلم لیا
دستِ یمیں نے جنگ میں آرام کم لیا
پھر دستِ چپ میں تیغ دو سر کو بہم لیا
تیورائے، سنبھلے، مُنہ سے لہو اُگلا، دم لیا
یاں بند ہو کے آنکھ کھُلی جتنی دیر میں
سو تیروں کو توڑ گئے اتنی دیر میں

تیغیں چڑھائی تھیں جو لعینوں نے سان پر
پڑتی تھیں وہ قریب سے اُس ناتوان پر
تیروں پہ تیر تھے، تو کمانیں کمان پر
ہلّہ تمام فوج کا تھا ایک جان پر
یوں برچھیاں تھیں چار طرف اُس جناب کے
جیسے کرن نکلتی ہے گردِ آفتاب کے

غش میں جھکا فرس پہ جو وہ غیرتِ قمر
مارا کسی نے فرق پہ اک گرزِ گاؤ سر
برچھی لگی جو سینے پہ، ٹکڑے ہوا جگر
گرتے تھے اسپ سے، کہ کمر پر لگا تبر
طارق کی تیغ کھا کے پکارے امام کو
”فریاد یا حسین! بچاؤ غلام کو“

جھپٹے جو شاہ فوج پہ چمکا کے راہوار
بجلی گری یزید کے لشکر پہ ایک بار
اِس غیظ میں یمیں سے جو آئے سوئے یسار
بھاگے بھگا کے گھوڑوں کی باگوں کو سب سوار
بھاگڑ میں خوں سے رن کی زمیں لال ہو گئی
دولھا کی لاش گھوڑوں سے پامال ہو گئی

دیکھا امام نے، کہ رگڑتے ہیں ایڑیاں ۔ سوکھے ہوئے لبوں پہ ہے اینٹھی ہوئی زباں
داماد سے لپٹ گئے حضرت بصد فغاں ۔ بے جاں ہوا حسین کے آگے وہ نیم جاں
جب لاش اُٹھائی شہ نے، تو چور استخوان تھے
سب چاند سے بدن پہ سموں کے نشان تھے

لاشہ اِدھر سے لے کے چلے شاہِ کربلا ۔ دوڑے اُدھر سے پیٹتے ناموسِ مصطفا
فضہ تھی آگے آگے کھُلے سر، برہنہ پا ۔ آئی جو صحن میں، تو یہ رانڈوں کو دی صدا
"چھپ جائے جس سے دور کا ناتا ہے صاحبو!
دولھا دُلھن کے لینے کو آتا ہے صاحبو!

"بہنیں کدھر ہیں؟ ڈالنے آنچل نہ یہ آئیں ۔ اب دیر کیا ہے؟ حجرے سے باہر دُلھن کو لائیں
رخصت ہو جلد، تاکہ براتی بھی چین پائیں ۔ جاگے ہیں ساری رات کے، اپنے گھروں کو جائیں
دل پر سہے فراق کی شمشیر تیز کو
کہہ دو دُلھن کی ماں سے نکالے جہیز کو"

رو کر بہن سے کہنے لگے شاہِ بحر و بر ۔ "اُس بے نصیب رانڈ کو لے آؤ لاش پر
بیٹی لٹے گی یوں، مجھے اس کی نہ تھی خبر ۔ اب شرم کیا ہے، دیکھ لے دولھا کو اک نظر
زخمی بھی ہے، شہید بھی ہے، بے پدر بھی ہے
دولھا بھی نام کو ہے، یہ چچا کا پسر بھی ہے"

حضرت یہ کہہ کے ہٹ گئے باچشم اشک بار ۔ بیٹی یہ سر، کہ غش ہوئی بانوے دل فگار
چادر سپید اُڑھا کے دُلھن کو بہ حالِ زار ۔ گودی میں لائیں زینبِ غمگین و سوگوار
چلائی ماں یہ گر کے تنِ پاش پاش پر
"قاسم بنے! اٹھو، دُلھن آئی ہے لاش پر

"صدقے گئی، بچی کو نہ ہوئے کہیں ملال رکھو دُلھن کی پیٹھ پہ ہاتھ اَے حسن کے لال!
واری بس اب اُٹھو، کہ پریشاں ہے میرا حال کیسا یہ خواب ہے، کہ دُلھن کا نہیں خیال
کروٹ تو لو، کہ ماں کے جگر کو قرار ہو
اس بچپنے کی نیند پہ امّاں نثار ہو"

جس دم دُلھن نے لاش کے ٹکڑوں پہ کی نگاہ نکلی لہو میں ڈوبی ہوئی اک جگر سے آہ
قدموں پہ سر جھکا کے پکاری وہ رشکِ ماہ "میرا قصور عفو ہو اَے میرے بادشاہ!
چھوڑا دُلھن کو لاش پہ رونے کے واسطے
دُولھا بنے تھے قبر میں سونے کے واسطے"

عباسِ علمدار کا جہاد

امام حسین کی تشویش

جس دم حسین لہرِ شبّر کو رو چکے — غربت میں یادگارِ برادر کو رو چکے
پالا تھا جس کو، اس مہِ انور کو رو چکے — صفدر کو، تشنہ لب کو، دلاور کو رو چکے

دل پر ہجومِ حسرت و اندوہ و یاس تھا
اِک بھائی اور ایک پسر شہ کے پاس تھا

رعشہ تنِ ضعیف میں، لب خشک، رنگ زرد — سینے میں گاہ ہوک اٹھی، گاہ دل میں درد
چھینٹیں قبا پہ خون کی تھیں، گیسوؤں پہ گرد — خالی پروں کو دیکھ کے بھرتے تھے آہِ سرد

غم تھا، کہ ابنِ فاطمہ آفت میں کیا کرے
اب ہم سے، دیکھیے، کسے قسمت جدا کرے

گردن جھکائے چپ تھے شہنشاہ بحر و بر — لب برگِ گل سے خشک تھے، رُخ آنسوؤں سے تر
صدمے سے ہاتھ ملتے تھے عباسِ نامور — پانی تھا غم سے اکبرِ ذی جاہ کا جگر

تلخ اِن کو زیست تھی، انھیں سر بارِ دوش تھا
دونوں دلاوروں کو شجاعت کا جوش تھا

بھائی اور بیٹا جنگ میں سبقت کا متمنی

عباس چاہتے تھے، کہ پہلے ہوں میں نثار — اکبر کا عزم تھا، کہ بس اب سر ہی تن پہ بار
بھائی کے غم میں دیں نہ آقائے نامدار — عمّو سے پہلے جائیں ہمیں بہرِ کارزار

جاتا ہی وقت ہاتھ سے گر اب فدا نہ ہوں
حضرت یہ چاہتے تھے، کہ دونوں جدا نہ ہوں

بولے بہا کے اشک علم دارِ نامدار — "ہَل مِن مُبارِز کی ہے اُس فوج میں پکار
یاں ایک شاہزادہ ہے اور اک یہ جاں نثار — آخر حضور دیں گے کسے اذنِ کارزار
دیکھیں تو آپ اُن کے نشانوں کے اَوج کو
اتنا تو ہو کوئی کہ نہ بڑھنے دے فوج کو"

شہ نے کہا کہ "اب مجھے کھانے دو تیغ و تیر — تم سا جوان قتل ہو جیتا رہے یہ پیر
تم یادگارِ شیرِ خدا، شاہِ قلعہ گیر — ہم صورتِ رسولِ خدا یہ مہِ منیر
سمجھے ہو سہل تم، مجھے مشکل ہے، کیا کروں
دو داغ اور ایک دل ہے، کیا کروں

"قوتِ جگر کی یہ ہیں، تو تم بازوؤں کا زور — بچھڑا جو دو میں ایک تو ہم ہیں کنارِ گور
ہوتا ہے زخمِ دل پہ نمک آنسوؤں کا شور — جب پتلیاں جدا ہوں تو چشمِ بشر ہے کور
تم پہلوؤں میں تھے، جو یہ بیکس سنبھل گیا
پھر خاتمہ ہے، جسم سے جب دم نکل گیا

"تم سے نشاں علی کا ہے، اِن سے ہمارا نام — گھر مٹ گیا نبی کا، جو دونوں ہوئے تمام
میت کے دفن کا بھی مقدم ہے اہتمام — مرنے کے بعد کوئی تو آئے ہمارے کام
تربت پہ ایسے گل ہوں، تو دل باغ باغ ہو
اندھیر ہے، جو قبر تلک بے چراغ ہو"

حضرت عباس کو پانی لانے کی اجازت

باتیں یہ تھیں ابھی کہ اٹھا شورِ العطش — شہ نے کہا "قریبِ ہلاکت ہیں فاقہ کش"
بولے بہا کے اشک علم دارِ ماہ وش — "شاید سکینہ جان کو پھر آ گیا ہے غش
کس سے کہیں، جو قلب پہ صدمے گزرتے ہیں
افسوس! ہم تو جیتے ہیں، معصوم مرتے ہیں

"دیکھا ہی جب سے لاشۂ قاسم کو پائمال
چھریاں جگر پہ چلتی ہیں، یا شاہِ خوش خصال!
گر قبلۂ اُمم سے ملے رُخصتِ جدال
دشتِ نبرد کو ابھی کر دیں لہو سے لال
رُوکے غلام کو، یہ کسی کا جگر نہیں
دریا نہ چھین لوں، تو علی کا پسر نہیں"

شہ نے کہا کہ "اس میں کسی کو ہی کیا کلام
تم غیظ میں جو آؤ، تو ہل جائیں روم و شام
بھائی! مگر یہ غیظ و غضب کا نہیں مقام
میری تو یہ دعا ہی، کہ ہو صابروں میں نام
پہلے مروں میں، تم نہ اگر سدِّ راہ ہو
مجھ کو نہیں قبول، کہ امت تباہ ہو"

عباس عرض کرتے ہیں "اے قبلۂ زماں!
بچوں کی مارے پیاس کے اب ہی لبوں پہ جاں
آنکھوں میں اس غلام کی تاریک ہی جہاں
یہ تین دن کی پیاس صغیروں کو الاماں!
ان کی رضا ملے جو شہِ خوش صفات سے
لے آؤں جا کے تھوڑا سا پانی فرات سے"

بولے بہا کے اشک امامِ فلک جناب
"ہی موت کا پیام یہ بچوں کا اضطراب
صابر ہر اک بلا میں ہی فرزندِ بوتراب
اچھا یہ ہی صلاح، تو کیجے تلاشِ آب
مشتاق آپ دیر سے جنگ و جدل کے ہیں
پانی کہاں کا، سب یہ بہانے اجل کے ہیں"

خیمے میں پہنچی رخصتِ عباس کی خبر
سب بی بیاں ہراس میں دوڑیں برہنہ سر
فضہ سے بولی زوجۂ عباسِ نامور
"کیا گھر میں وہ نہ آئیں گے باندھے ہوئے کمر؟
اچھا، سدھارتے ہیں، تو خیمے میں آ کے جائیں
فرزند روتے ہیں انھیں صورت دکھا کے جائیں"

فضّہ سے رو کے کہنے لگی خواہرِ امام
"میری طرف سے دے یہ علم دار کو پیام
سنتی ہوں میں کہ جاتے ہو سوئے سپاہِ شام
کیونکر جئیں گے ہجر میں شبیرِ تشنہ کام
کس کو خبر ہے نہر پہ جا کر کب آؤ گے
بے کس بہن سے کیا نہ گلے مل کے جاؤ گے؟"

عباسؑ آئے خیمے کے اندر جھکائے سر
تسلیم کر کے جھک گئے زینبؑ کے پاؤں پر
سر کو لگا کے چھاتی سے بولی وہ نوحہ گر
"عباسؑ تم نہ ہوگے تو لٹ جائے گا یہ گھر
جاتا ہے یوں کسی سے کوئی آنکھ موڑ کے؟
بھیّا کدھر چلے مرے بھائی کو چھوڑ کے؟

"دیکھو تو حالِ سبطِ رسولِ فلک اساس
بیٹی کا غم، بھتیجے کا ماتم، ہجومِ یاس
ہے کثرتِ سپاہ میں تنہا وہ حق شناس
قربان جاؤں، تم تو رہو بے وطن کے پاس
عاشق ہو دلبرِ اسدِ ذوالجلال کے
بازو قوی تمھیں سے ہیں زہرا کے لال کے"

عباسؑ کہتے ہیں کہ "نہ جاؤں تو کیا کروں
کیونکر نہ حق امامِ زماں کا ادا کروں
اُلٹوں صفیں، ہزاروں سے تنہا وغا کروں
یہ سر ہے اس لیے کہ قدم پر فدا کروں
پہنچا ہے فیض سیّدِ خوش خو کے ہاتھ سے
دنیا میں کچھ تو کام ہو بازو کے ہاتھ سے

"رخصت طلب ہے شاہ سے اکبرؑ سا لالہ فام
شہزادہ مرنے جائے، سلامت رہے غلام!
للّٰہ دیکھیے نہ اب، اے خواہرِ امام!
وہ بات کیجیے کہ بڑھے جس سے میرا نام
بے کس ہوں، ساتھ ماں نہیں، سر پر پدر نہیں
میں آپ کا غلام تو ہوں، گو پسر نہیں"

زوجہ سے رخصت

ہاتیں یہ پتی کے روتی ہیں زینب جھکائے سر   تھرا رہی ہے زوجۂ عباسِ نامور
چہرہ تو فق ہے، گود میں ہے چاند سا پسر   مانع ہے شرم، روتی ہے منہ پھیر پھیر کر
موقع نہ رونے کا ہے، نہ بول سکتی ہے
زینب کے منہ کو نرگسی آنکھوں سے تکتی ہے

عباس دیکھتے ہیں جو زوجہ کا حالِ زار   ہوتا ہے تیرِ غم جگرِ ناتواں کے پار
روتے ہیں خود، مگر یہ اشارہ ہے بار بار   "شوہر کے غم میں یوں کوئی ہوتا ہے بے قرار؟
آؤ ادب سے دلبرِ زہرا کے سامنے
روتی ہیں لونڈیاں کہیں آقا کے سامنے؟

"کھولا ہے گوندھے بالوں کو صاحب! یہ کیا کیا   روتی ہو تم تو روتا ہے فرزندِ مہ لقا
خیر النسا کے لال پہ ہوتے ہیں ہم فدا   شادی کا ہے مقام، کہ ماتم کی ہے یہ جا؟
ایذا میں صبر صاحبِ ہمت کا کام ہے
میری بھی آبرو ہے، تمھارا بھی نام ہے

"لو پونچھ ڈالو آنسوؤں کو بہرِ ذوالجلال   دیکھو زیادہ رونے سے ہوگا مجھے ملال
میری مفارقت کا نہ کیجو کبھی خیال   قائم تمھارے سر پہ رہے فاطمہ کا لال
غم چاہیے، نہ آہ و بکا چاہیے تمھیں
شہ کی سلامتی کی دعا چاہیے تمھیں

"قاسم کو دیکھو، جانبِ کبرا کرو نگاہ   گزری جو شب، تو صبح کو گھر ہو گیا تباہ
دشمن کو بھی دکھائے نہ اللہ ایسا بیاہ   کیا صابرہ ہے دخترِ شبیرؑ، واہ واہ!
سہتے ہیں یوں جہاں میں جفا رانڈ ہونے کی
آواز بھی بھلا کوئی سنتا ہے رونے کی

"آفت میں صبر کرتی ہیں اس طرح بی بیاں ہوتا ہے صابروں کا مصیبت میں امتحاں
جل جائے دل، مگر نہ اُٹھے آہ کا دھواں اُف کیجیو نہ منھ سے، جو پہنچے لبوں پہ جاں
پر چار ہے کہ وقت پہ کیا کام کر گئی
چھوٹی بہو علی کی بڑا نام کر گئی"

مشکیزہ لے کے آئی سکینہ چچا کے پاس روئے گلے لگا کے علمدارِ حق شناس
کہنے لگی لپٹ کے وہ بچی بہ دردِ یاس "للہ عمو جان! بجھا دو ہماری پیاس
پھنکتا ہے دل عطش سے، کلیجا کباب ہے
سقائی کیجیے، کہ یہ کارِ ثواب ہے"

عباس نے کہا کہ "مرا فخر ہے یہ کام بی بی! تمھارے باپ کا ادنیٰ ہوں میں غلام
دی تم نے آبرو مجھے اے دخترِ امام! اب ہو گیا جہاں میں ہمیشہ ہمارا نام
کوثر میں سمجھوں، دوش پہ گر مشکِ آب ہو
تم بھی دعا کرو، کہ چچا کامیاب ہو"

یارب! جہاں میں بھائی سے بھائی جدا نہ ہو دشمن بھی اس بلا میں کوئی مبتلا نہ ہو
بازو کے ٹوٹنے کی کسی پہ جفا نہ ہو مر جائے خود، پہ یہ الم جاں گزا نہ ہو
صدمہ عجب ہے بادشہِ کائنات پر
آنکھوں سے اشک بہتے ہیں بات بات پر

صابر کا ہے یہ حال کہ مشکل ہے ضبطِ آہ فرماتے ہیں کہ "تھام لے بندے کو یا الٰہ!
کیا مرحلہ ہے صعب، یہ کیونکر کٹے گی راہ؟ بھائی ہے مرا، یہی لشکر، یہی سپاہ
آخر بشر ہوں میں، جو نہ روؤں، تو کیا کروں
تیغِ علی کو ہاتھ سے کھوؤں، تو کیا کروں"

روتا ہوا جھکا پئے تسلیم وہ جری — سب روئے، مشک دوشِ مبارک پہ جب پڑی
اِک آہ سرد زوجۂ عباس نے بھری — صدمے سے رنگ زرد تھا اور تن میں تھرتھری
سر سے ردا بھی دوش تلک آکے گر پڑی
بانو کے پاس خاک پہ غش کھا کے گر پڑی

آمد

نکلا حرم سرا سے جو وہ آسماں حشم — نصرت نے گرد پھر کے لیے بوسۂ قدم
شوکت وہ اُس جناب کی، وہ رفعتِ علم — پنجے کی ضو سے برق چمکتی تھی دم بہ دم
ذرّوں سے شرمگیں تھے گہر، لعل سنگ سے
صحرا زمردی تھا پھریرے کے رنگ سے

وہ ضو علم کی، وہ رُخِ عباسِ نامور — رکھے تھا ہاتھ چہرے پہ خورشید خیرہ سر
پنجہ اُدھر علم کا، رخِ پُر ضیا اِدھر — دو نور سر دی تہ و بالا تھے جلوہ گر
یکتا وہ زرق برق میں، یہ آب و تاب میں
تھا فرق ایک نیزے کا دو آفتاب میں

ناگاہ غل ہوا، فرسِ تیز گام لاؤ — آیا علی کا سروِ رواں، خوش خرام لاؤ
ہاں رخشِ تیز رَو کو بصد اہتمام لاؤ — اسپِ گراں رکاب و مرصع لجام لاؤ
ہے انتظار ابرشِ آہو شکار کا
بیٹا سوار ہوئے گا دُلدُل سوار کا

گھوڑے کی تعریف

آیا فرس سجا ہوا کس ترک تاز سے — سرعت کا قافلہ نکل آیا حجاز سے
رکھتا تھا پاؤں خاک پہ اس امتیاز سے — جیسے پری چمن میں خراماں ہو ناز سے
فوق اُس کو تھا ہمائے سعادت نشان پہ
سُم تھے زمیں پہ، تو دماغ آسمان پہ

وہ تھوتھنی، کہ غنچۂ سوسن سے تنگ تر وہ انکھڑیاں، خجل ہو ہرن جن کو دیکھ کر
کھلیں نجوم، نعل ہلال، اور سم قمر باریک جلد، سینہ کشادہ، بلند سر
کھاتی تھی ہر پری بھی قسم اُس کی جان کی
غصّہ یہ تھا کہ تنگ ہے وسعت جہان کی

وہ شوخیاں فرس کی، وہ سُرعت، وہ آؤ جاؤ سو حسن تھا، فقط جسے ہیکل کا اک بناؤ
جب چاہو، سیر عالمِ امکاں کی کرکے آؤ تازی ہو روح، پاؤ قدم میں وہ لطف پاؤ
رفعت میں پست حوصلہ کبکِ دری کا تھا
چھلبل ہرن کی تھی، تو جھمکڑا پری کا تھا

گھوڑا اُڑا، کہ ہو گئی سرعت ہوا کی گرد بوٹے چمن بنی قدمِ بادپا کی گرد
جا پہنچی تا بہ فرقِ ثریا ثرا کی گرد اُڑ کر سرِ فلک پہ گئی کربلا کی گرد
خورشید کی ضیا تھی سموں کے نشان پر
نخوت سے تھا زمیں کا دماغ آسمان پر

کیونکر لکھے کمیتِ قلم سُرعتِ سمند آہو شکار، شیر طبیعت، وغا پسند
نازک مزاج و خوش قد و طناز و سربلند وہ پیش و پس، وہ سُم، وہ کنوتی، وہ جوڑ بند
اُتری تھی اک پری، فرس تند خو نہ تھا
سُرعت بھری ہوئی تھی، رگوں میں لہو نہ تھا

وہ زیبِ زین زین کی، وہ ساز کی پھبن زیور سے جیسے ہوتی ہے آراستہ دُلھن
چشمِ سیاہ دیدۂ آہو پہ طعنہ زن سُرعت یہ تھی کہ بھولتے تھے چوکڑی ہرن
جادو تھا، معجزہ تھا، پری تھا، طلسم تھا
پاکھر نہ تھی، زرہ میں تہمتن کا جسم تھا

رکھا قدم رکاب میں حیدر کے لال نے
نعلینِ پا کو فخر سے چوما ہلال نے
بخشی جو صدرِ زیں کو ضیا خوش جمال نے
دُم کو چنور کیا فرسِ بے مثال نے

کس ناز سے وہ رشکِ غزالِ ختن چلا
طاؤس تھا، کہ سیر کو سوئے چمن چلا

بڑھنے میں حرفِ ہاں جو دہن سے نکل گیا
وحشی غزالِ دشتِ ختن سے نکل گیا
لشکر گلوں کی بو کا چمن سے نکل گیا
جھونکا نسیم کا تھا، کہ سَن سے نکل گیا

طاؤس کیا، کہ برق بھی شرما کے رہ گئی
پچھلے سموں کی گرد نظر آ کے رہ گئی

خوش بو سے ارضِ پاک ریاضِ جناں بنی
گرد اڑ کے غازۂ رُخِ لیلیٰ وشاں بنی
جلوے سے راہ دشتِ بلا کہکشاں بنی
ذرّے بنے نجوم، زمیں آسماں بنی

سُم بدر تھے، تو نعل بھی چاروں ہلال تھے
نقشِ سُمِ فرس سے ہزاروں ہلال تھے

رعب و دبدبہ

اللہ ری جلالت و شوکت حضور کی!
دہشت سے اُٹھ نہ سکتی تھی گردن غرور کی
ہر جا فرس شکوہ دکھاتا تھا طور کی
بجلی قدم قدم پہ چمکتی تھی نور کی

ذرّوں کی ضو سے مہرِ جہاں تاب زرد تھا
مٹّی میں یہ دمک تھی، کہ کندن بھی گرد تھا

وہ دبدبہ، وہ سطوتِ شاہانہ، وہ شباب
تھرّا رہا تھا جس کی جلالت سے آفتاب
وہ رعبِ حق، کہ شیر کا زہرہ ہو آب آب
صولت میں فرد، دفترِ جرأت میں انتخاب

صورت میں سارے طور خدا کے ولی کے ہیں
شوکت پکارتی ہے کہ بیٹے علی کے ہیں

قربانِ احتشامِ علم دارِ حق پژوہ لرزاں تھا جس جری کے تہور سے دشت کوہ
سردارِ صفدروں کا، دلیروں کا سرگروہ حمزہ کا دبدبہ، اسداللہ کی شکوہ
دل کانپتے تھے دیکھ کے تیور دلیر کے
گویا سپاہ شام تھی پنجے میں شیر کے

چھایا تھا سب پہ رعب علمدار نوجواں تسلیم کو جھکے ہوئے تھے فوج کے نشاں
گوشہ اماں کا ڈھونڈ رہی تھی ہر اک کماں ترکش بھی تھے ہراس میں کھولے ہوئے دہاں
تیروں کا بے گماں تھا ارادہ گریز کا
منھ کند ہو گیا تھا ہر اک تیغ تیز کا

پہنچا جو اس جلال سے وہ آفتاب دیں دیکھا سپاہ کو صفتِ شیرِ خشمگیں
گاڑا جو دبدبے سے علم، ہل گئی زمیں ہٹ ہٹ کے مورچوں سے پکارے یہ اہل کیں
غازی ہے، صف شکن ہے، جری ہے، دلیر ہے
ہٹنا نہ تھا ترائی سے جو، یہ وہ شیر ہے

یہ سن کے تہلکہ صفِ اعدا میں پڑ گیا ٹوٹا یہ مورچہ، وہ رسالہ بگڑ گیا
ہر غول میں علم سے علم جھک کے لڑ گیا جو رہ گیا نشاں، وہ خجالت سے گڑ گیا
ہلچل میں چنگیوں سے جو چلے نکل گئے
اس صف کے تیر سہم کے اُس صف پہ چل گئے

تیغیں کھنچی لیے ہوئے بھاگے جو اہل شر کٹ کر کسی کا ہاتھ گرا، اور کسی کا سر
تلواریاں پڑی تھی کسی کی، تو واں سپر برچھی تھی اس شقی کی، تو اُس نحس کا جگر
یہ جنگ تھی کہ حشر، کوئی جانتا نہ تھا
بیٹے کو باپ خوف سے پہچانتا نہ تھا

تھا فوجِ قاہرہ میں تلاطم کہ الحذر! موجوں کی طرح تھیں سب اِدھر کی صفیں اُدھر
چکر میں تھی سپاہ، کہ گردش میں تھا بھنور پانی میں تھے نہنگ، ابھرتے نہ تھے مگر
فوجیں فقط نہ بھاگ گئی تھیں مُنھ موڑ موڑ کے
دریا بھی ہٹ گیا تھا کنارے کو چھوڑ کے

ابن سعد کا لشکر کو جوش دلانا

گھبرا گئے ابن سعد نے لشکر کو دی صدا "چھوڑ آئے مورچوں کو، شجاعو! یہ کیا کیا
اتنا ہراس، نامورو! ننگ کی ہے جا وہ کون تھے علی سے لڑے جو دمِ وغا؟
سب مل کے روکتے نہیں اِس تشنہ کام کو
کھوتے ہو معرکے میں بزرگوں کے نام کو

"قاتل تمہارے جدّ و پدر کا تھا جو دلیر ہاں غازیو! اسی کا جگر بند ہے یہ شیر
کرتے ہیں رستموں کو زبردستیوں سے زیر دشمن کو پا کے واہ یہ کم جرأتی، یہ دیر
بڑھ بڑھ کے یوں لڑو کہ تہمتن بھی گرد ہو
لو کشتگانِ بدر کا بدلہ جو مرد ہو"

یہ سُن کے سب کو جوش حمیت کا آ گیا ابلیس آ کے راہِ ضلالت بتا گیا
پھر ابرِ فوجِ شام لبِ نہر چھا گیا شورِ دہل سے رعد کا دل تھرتھرا گیا
جو جو تھے منتشر، وہ پرے پھر بہم ہوئے
پھر سب نشان کھل گئے، نیزے علم ہوئے

جب اُن کے دل بڑھے، تو سواروں کے دل بڑھے گرز اپنا تول تول کے لشکر کے یل بڑھے
ہر صف سے یوں اُپے ہوئے تیغوں کے پھل بڑھے جس طرح قبضِ روح کو دستِ اجل بڑھے
تنہا تھا وہ صفیں تھیں بہم جس کے واسطے
یہ معرکہ تھا، اک متنفس کے واسطے

اُلٹی علی کے شیر نے بھی آستیں اِدھر
قبضے پہ ہاتھ اُدھر گیا، کانپی زمیں اِدھر
ظاہر ہوا جلالِ جہاں آفریں اِدھر
آیا جلال میں اسدِ خشم گیں اِدھر
صف پر جو صف گری، تو پیادہ سوار پر
گویا علی نے ہاتھ رکھا ذوالفقار پر

اَے رخشِ خامہ! شوخی و جولاں گری دکھا
اَے نطقِ سحر کار! زباں آوری دکھا
اَے شہسوارِ فوجِ سخن! صفدری دکھا
اَے زورِ طبع! دبدبۂ حیدری دکھا
سطریں بنیں ورق پہ صفیں کارزار کی
مصرع ہر اک دکھائے برش ذوالفقار کی

ہاں اَے قلم! سروں کی جدائی دکھا مجھے
خندق کی اور اُحد کی لڑائی دکھا مجھے
دریائے کشت و خوں کی ترائی دکھا مجھے
شمشیرِ مصطفےٰ کی صفائی دکھا مجھے
دل شق کرے صریرِ قلم کارزار میں
غُل ہو، کہ شیر گونج رہا ہے کچھار میں

آئے سمٹ کے نہر پہ وہ شامیوں کے دَل
تیغیں کھنچیں، چمکنے لگے برچھیوں کے پھل
کڑکیں کمانیں، آنے لگے ناوکِ اجل
غازی کے تیوروں پہ پڑے اس طرح بھی بل
بڑھ کر رجز پڑھا، کہ پرے تھرتھرا گئے
خیبر کے سرکشوں کو علی یاد آ گئے

نکلے وہ شعر طبع فصاحت شعار سے
فقرے تھے جن کے تیز کہیں ذوالفقار سے
نقطے تھے آبدار، دُرِ آبدار سے رجز
مضموں برش میں تیز تھے خنجر کی دھار سے
اعدا کے نظم و ضبط کی صورت بدل گئی
تیغ دو دم عرب کے فصیحوں پہ چل گئی

نعرہ یہ تھا کہ "ہم درِ دریائے نور ہیں"   دُنیا کے جتنے عیب ہیں، سب ہم سے دور ہیں
خیبر کشا کے قلب و جگر کے سُرور ہیں   جرار ہیں، سخی ہیں، ولی ہیں، غیور ہیں
اپنا چلن کھلا ہوا سب عاقلوں پہ ہے
اب تک ہماری ضرب کا سکہ دلوں پہ ہے

"رُو کے ہمیں نکل کے، جو طاقت کسی میں ہو   لے تیغ میاں سے، جو شجاعت کسی میں ہو
گرمائے رخش کو، جو حرارت کسی میں ہو   آئے، جو حرب و ضرب کی قدرت کسی میں ہو
فرزند ہیں علی سے شہِ قلعہ گیر کے
پھینکیں زمیں پہ کلۂ اژدر کو چیر کے

"تم کیا، پہاڑ بیچ میں گر ہو تو ٹال دیں   شیروں کو ہم ترائی سے باہر نکال دیں
مہلت نہ ایک کو دمِ جنگ و جدال دیں   پانی تو کیا ہے، آگ میں گھوڑے کو ڈال دیں
منہ دیکھتے رہیں، جو نگہباں ہیں گھاٹ کے
لے جائیں گھر پہ، تیغ سے دریا کو کاٹ کے

"جرأت جلو میں رہتی ہے، نصرت رکاب میں   لیتے ہیں گھاٹ پھیر کے تیغوں کی آب میں
لکھے ہوئے ہیں شیروں کے حملے کتاب میں   فصلیں ہیں اپنے زور کی خیبر کے باب میں
ناصر ہیں بادشاہِ فلک بارگاہ کے
دفتر اُلٹ دیے ہیں عرب کی سپاہ کے

پانی کا سوال

"عبرت کی یہ جگہ ہے، کہ ہم اور سوالِ آب   سقّا بنے ہیں دیکھ کے بچوں کا اضطراب
اِس مشک نے کیا ہمیں عقبیٰ میں کامیاب   اللہ ری آبرو! کہ بہشتی ملا خطاب
شہ سے نشانِ فوج، پیمبر بھی مل گیا
طوبیٰ کے ساتھ چشمۂ کوثر بھی مل گیا

"بے مشک کے بھرے ہمیں آتا ہے چین کب
گرمی میں پیاس سے کئی بچے ہیں جاں بہ لب
صغرا کو گودیوں میں تڑپتے کٹی ہے شب
کیا وقت ہے حسین کے بچوں پہ، ہے غضب!
لالے پڑے ہوئے ہیں سکینہ کی جان کے
کانٹے مجھے دکھائے تھے سوکھی زبان کے

"یہ دھوپ، یہ خیام کا تپنا، یہ گرم بن
مرجھا گیا ہے احمدِ مختار کا چمن
مانندِ غنچہ پیاس سے کھولے ہیں سب دہن
پانی بغیر اب نہ بچیں گے وہ گل بدن
گرمی میں ہاتھ پاؤں غریبوں کے سرد ہیں
نیلے ہیں ہونٹ، پھول سے رخسار زرد ہیں"

شمر کا جواب

چلایا شمر تب کہ "عبث ہے سوالِ آب
دیں گے زبانِ تیغ سے ہم آپ کو جواب
بچوں کی پیاس سے ہے جو حضرت کو اضطراب
پھر کس لیے ہے بیعتِ حاکم سے اجتناب؟
خیمے سے گھٹنیوں اگر اصغر بھی آئے گا
جز آبِ تیر پانی کا قطرہ نہ پائے گا"

ایسا سخن کبھی جو سنا تھا نہ کان سے
برچھی لگی، مگر نہ کہا کچھ زبان سے
جھومے فرس پہ جب شہِ مرداں کی شان سے
بس خود بخود اُگلنے لگی تیغ میان سے
نعرہ کیا کہ "او سگِ ناپاک! دور ہو
یہ کیا سخن ہے، منہ میں ترے خاک، دور ہو

"تو کیا ہے اور کیا ہے تراداہ امیرِ شام؟
کرتے ہیں بادشاہ کہیں بیعتِ غلام؟
تو بھی نمک حرام ہے، وہ بھی نمک حرام
او بے ادب! یزید کجا اور کجا امام
دوزخ سے دور رہتے ہیں ساکن بہشت کے
کعبہ کبھی جھکا نہیں آگے کنشت کے

"حجت تمام کرنے کی خاطر تھے یہ کلام — ظالم، شراب خوار کی بیعت کرے امام!
سوکھی ہوئی زباں جو ہلاوے وہ تشنہ کام — حاضر ابھی ہوں چشمۂ کوثر کے لاکھ جام
قدرت ہے سب طرح کی امام جلیل کو
چاہیں، تو وہ سبیل کریں سلسبیل کو

"کیا جانے مرتبہ پسر فاطمہ کا تو — عزت بہشت کی ہیں، تو کوثر کی آبرو
سردار، بردبار، نکوکار، نیک خو — ان کا عدو خدا و پیمبر کا ہے عدو
جاری ہے فیض فاطمہ کے نورِ عین کا
غاصب ہے تو، یہ نہر بھی ہے حق حسین کا"

یہ کہہ کے لی نیام سے تیغ شرر فشاں — شعلے نے الحذر کہا، بجلی نے الاماں جگ
آواز دی زمیں نے کہ یا حافظِ جہاں — دہشت سے تھرتھرا گیا مریخ آسماں
ثابت ہوا، کہ چہرۂ خورشید کٹ گیا
غل تھا کہ فوجِ شام کا دفتر الٹ گیا

کانپے طبق زمیں کے، ہلا چرخ لاجورد — مانند کہربا ہوا مٹی کا رنگ زرد
اٹھ کر زمیں سے، بیٹھ گئی زلزلے میں گرد — تیغوں کی آنچ دیکھ کے بھاگی ہوائے سرد
گرمی سے رن کی ہوش اڑے وحش و طیر کے
شیر اُس طرف اُتر گئے دریا کو پیر کے

اے زورِ طبع! جوہرِ سیف دو دم دکھا — اے جوشِ فکر! خونِ سیاہ ستم دکھا
اے خامۂ رواں! سرِ اعدا قلم دکھا — اے ذہن! پھر تلاطمِ بحر العلم دکھا
سب پر عیاں ہوں شیر کے حملے لڑائی میں
پھر جنگ نہرواں نظر آئے ترائی میں

جب رن میں تیغ تیز علم کی جناب نے
لی رُخ پہ تھرتھرا کے سپر آفتاب نے
جلوہ کیا جو دشت میں اُس برق تاب نے
گھیرا منافقوں کو خدا کے عتاب نے
بجلی کی برق وشرق بھی نظروں سے گر گئی
تلوار موت بن کے نگاہوں میں پھر گئی

ٹوٹے وہ مورچے، جو بندھے تھے پئے جدال
برچھی گری زمیں پہ کسی کی، کسی کی ڈھال
اللہ ری ہیبتِ خلفِ شیرِ ذوالجلال!
کانپی زمیں، کھڑے ہوئے روئیں تنوں کے بال
مُنھ زرد ہو کے رہ گیا ہر نوجوان کا
دشتِ نبرد کھیت بنا زعفران کا

جاتی تھی ہر پرے کی طرف تن سے بار بار
چڑھ کر سوار گرتے تھے توسن سے بار بار
اُٹھتی تھی 'الاماں' کی صدا رن سے بار بار
ہر سر کا بار اُترتا تھا گردن سے بار بار
غارت ہوئے، تباہ ہوئے، بے تزک ہوئے
ضربِ گراں جو اُٹھ نہ سکی، کیا ٹنک ہوئے

تھی ابتری سپاہِ ضلالت شعار میں
اس صف میں تھی وہ صف، یہ قطار اُس قطار میں
سو بار جو لڑے تھے اکیلے ہزار میں
وہ جائے امن ڈھونڈھتے تھے کارزار میں
چہرے تھے زرد خوف سے حیدر کے لال کے
نامرد منھ چھپاتے تھے گھونگھٹ میں ڈھال کے

آمد تھی تیغ کی کہ اجل کا پیام تھا
یہ صف اخیر تھی، وہ رسالہ تمام تھا
بجلی سا ہر جگہ فرسِ تیز گام تھا
ششدر تھی موت، چار طرف قتلِ عام تھا
اس غول پر کبھی تھی، کبھی اُس قطار پر
پڑتا تھا ایک تیغ کا سایہ ہزار پر

نیزے اِدھر قلم، تو اُدھر برچھیاں قلم ترکش دو نیم، ٹکڑے کمانیں، نشاں قلم
ہر ہاتھ میں قلم کی طرح استخواں قلم مُنھ تیغ کا خراب، سناں کی زباں قلم
جب سن سے آئی سر پہ کسی بدخصال کے
گویا سموم چل گئی پھولوں پہ ڈھال کے

اعدا کے حق میں ہو گیا آبِ حسام سم کرتے تھے آہوؤں کی طرح خوش خرام رم
نیزے تھے خوں سے صفتِ چوبِ خام خم ایسا لڑا جہاں میں کوئی تشنہ کام کم
دشمن بھی معترف تھے، وہ پیکار کر گئے
مقتل سے اُڑ کے تا سرِ کہسار سر گئے

ڈھالوں سے شامیوں کی اُدھر چھا گئی گھٹا دریا پہ جھوم جھوم کے سب آ گئی گھٹا
ایسا بڑھا یہ اَبر کہ شرما گئی گھٹا بارانِ تیر دشت میں برسا گئی گھٹا
کشتوں کو اپنے فوج عدو رَوندنے لگی
جنگل میں برقِ قہرِ خدا کوندنے لگی

جس غول پر چلی، نہ رُکی نہ تھمی کہیں اِک دَم بھی کی نہ اُس نے بُرش میں کمی کہیں
چمکی کہیں، کسی وہ کسی جا، دَمی کہیں فوجوں میں ابتری تھی کہیں، برہمی کہیں
کاٹے ہوئے نشاں تھے زمیں پر پڑے ہوئے
ہر جا تھے ضربِ تیغ کے جھنڈے گڑے ہوئے

یوں مورچوں کو چاٹ گئی تیغِ شعلہ رنگ لوہے کو خاکِ شور میں کھا جائے جیسے زنگ
گُروں سے کھنچ نہ سکتے تھے خنجر میانِ جنگ جوشن جو کٹ گئے تھے، تو چار آئنے تھے دنگ
تلواریں منھ چھپائے تھیں ضربِ درشت سے
ڈھالیں لپٹ گئی تھیں سواروں کی پُشت سے

گوراوہ ہاتھ اور وہ تلوار کی چمک — تھی صاف تیغ حیدرِ کرار کی چمک
موجوں پہ عکس ڈالتی تھی دھار کی چمک — اُس پار تک پہنچتی تھی اس پار کی چمک
اک شور تھا کہ آگ لگی کائنات میں
خشکی میں زلزلہ تھا، تلاطم فرات میں

نکلا اُدھر سے جو، وہ اجل کا شکار تھا — پیدل ہو یا سوار، یہ دو تھا، وہ چار تھا
کوسوں لہو سے دشتِ ستم لالہ زار تھا — بجلی چمک رہی تھی، فرس بے قرار تھا
کیا ہو زرہ سے ضرب جو ایسی کڑی لگے
سروں پہ برس رہے تھے کہ جیسے جھڑی لگے

تیغ دو دم سروں سے گزرتی تھی دم بہ دم — دوزخ میں فوجِ شام کی بھرتی تھی دم بہ دم
بڑھتی تھی دم بہ دم، تو ٹھہرتی تھی دم بہ دم — ندی لہو کی چڑھ کے اُترتی تھی دم بہ دم
ڈر سے جگر بھی آب تھے، زہرے بھی آب تھے
موجیں تھیں دست و پا کی، سروں کے حباب تھے

ثابت رہی نہ ڈھال، نہ مغفر، نہ سر بچا — سینے میں دل کو کاٹ گئی، گر جگر بچا
دو ٹکڑے ہو گیا وہ اُدھر، جو اِدھر بچا — بے زخم کھائے ایک نہ بیداد گر بچا
تلوار سے کوئی، کوئی ڈر سے ہلاک تھا
سالم تھا جس کا جسم، جگر اُس کا چاک تھا

وہ تیغ کی تڑپ، وہ تگ و دو سمند کی — وحشت ہرن کی، تیز پری تھی پرند کی
ترکیب کچھ جدا تھی ہر اک جوڑ بند کی — پنہاں ہوا سوار، جو گردن بلند کی
پریوں کی جان جاتی تھی یال اُس کی دیکھ کر
طاؤس سر جھکاتے تھے چال اُس کی دیکھ کر

آغازِ جنگ میں وہ تگ و دو، وہ آؤ جاؤ — گھونگھٹ نیا تھا، چال نئی تھی، نیا بناؤ
جاتا تھا یوں، اُتار ہو رستے میں یا چڑھاؤ — جیسے ہوا میں جاتی ہے آبِ رواں پہ ناؤ
تھا صاحبِ عَلم بھی جدل پر تُلا ہوا
کشتی کا بادباں تھا پھریرا کھُلا ہوا

چیتے کی جست، شیر کی چتون، ہرن کی آنکھ — شرمائے جس سے آہوئے چین یا ختن کی آنکھ
پڑتی تھی یوں حریف پہ اُس صف شکن کی آنکھ — لڑتی ہے جیسے جنگ میں شمشیر زن کی آنکھ
راکب شجاع تھا، تو فرس بھی دلیر تھا
گھوڑا پری وش تھا، کہ غزالوں میں شیر تھا

رہوار پھر رہا تھا طرارے اِدھر اُدھر — سب بھاگتے تھے خوف کے مارے اِدھر اُدھر
اُڑتے تھے اُس کے دُم سے شرارے اِدھر اُدھر — دنبالہ دار گرتے تھے تارے اِدھر اُدھر
دریا پہ ہاتھ دھوئے تھے سب اپنی جان سے
تلوار کیا، برستی تھی آگ آسمان سے

تھا "الاماں" کا شور، پریشاں تھے اہلِ شر — تیغوں کے پیچھے ڈر کے چھپی تھی ہر اک سپر
ماتھے علم نہ گرتے تھے جھک کے خاک پر — پرچم نے بال کھولے تھے فریادیوں نے سر
دانتوں میں خس ہراس سے تھی ہر جوان کے
چادر ہلا رہے تھے پھریرے نشان کے

تھرّا رہا تھا خوف سے مینائے لاجورد — ہلتے تھے کوہ، کانپتا تھا وادیٔ نبرد
تھا دن بھی زرد، دھوپ بھی زرد اور زمیں بھی زرد — خورشید چھپ گیا، یہ اُٹھی کربلا میں گرد
اِک تیرگی غبار سے تھی چشمِ دہر میں
تالو پڑے ہوئے تھے محیطِ سپہر میں

ڈر سے ہوا تھی ایک طرف، گرد اک طرف
بھرتے تھے خیبری بھی دمِ سرد اک طرف
سمٹے ہوئے تھے کوفے کے نامرد اک طرف
تھے رُوسیاہ شام کے سب زود اک طرف
بھاگے تھے نیزہ باز لڑائی کو چھوڑ کے
ضیغم نکل گئے تھے ترائی کو چھوڑ کے

تھا شش جہت میں غل، کہ یہ ہے رزم انقلاب
اُلٹے گا اس زمیں کا ورق ابنِ بوتراب
اس شیر سے نہ ہوگی کوئی فوج فتح یاب
بس اب بنائے عالمِ امکاں ہوئی خراب
حملہ غضب ہے بازوئے شاہِ حجاز کا
لنگر نہ ٹوٹ جائے زمیں کے جہاز کا

اللہ رے بے حواسیِ فوجِ جفا پسند!
دہشت سے رستموں کے لرزتے تھے بند بند
بڑھ کر پکارے حضرتِ عباس ارجمند
"جم کر لڑو کہ نام شجاعوں میں ہو بلند
مرتے ہیں مارے پیاس کے واں بے گناہ دو
لڑتے نہیں تو نہر پہ جانے کی راہ دو"

یہ سن کے ابن سعد لعیں نے پرے جمائے
دستے ستم کے گھاٹ پہ دریا کے اُور آئے
اک شور تھا، کہ اب یہ بہشتی نہ بڑھنے پائے
تلوار رکھ کے کاندھے پہ عباس مسکرائے
موت آئی اُس کے سر پہ جو آفت نصیب تھا
چھیڑا تو رخش اُڑ کے صفوں کے قریب تھا

شمشیر زن کے ہاتھ میں دستِ خدا کا زور
پہنچا تھا ہاتھوں ہاتھ جسے مرتضیٰ کا زور
کس بل غضب کا، قہر کی ضربت بلا کا زور
نعرہ یہ تھا کہ "مجھ میں ہو مشکل کُشا کا زور
مرحب سا، اتنی فوج میں، اک نامور نہیں
کیونکر کھلے یہ زور کہ خیبر کا در نہیں

"حسرت یہی وغا کی دلِ حق پسند کو
کھولا نہ ایک نے مرے نیزے کے بند کو
پستی میں لاؤں اوج سے کس سر بلند کو؟
خندق میں عمرو ہو، تو اڑماؤں سمند کو
دو ٹکڑے کر دوں رستمِ دستاں کے گیو کے
پٹکے سے باندھوں مثلِ علی ہاتھ دیو کے"

پہلوان سے مقابلہ

اِک خوں گرفتہ سُن کے یہ نکلا پئے جدال
تند و صدا، مہیب ادا، اہرمن خصال
چہرے کا اور سپر کی سیاہی کا ایک حال
بدخواہِ خاندانِ محمدؐ، عدوئے آل
نامِ علی کسی نے لیا جب، تو جل گیا
نکلا نہ دل سے بغض، نہ ابرو سے بل گیا

مغفر تنور تھا، تو زرہ موجِ رودِ نیل
عمرو ابنِ عبدِ ود سے بھی قامت میں کچھ طویل
حملے میں تھا جو دیو، تو مکر میں مست فیل
بے مثل بغض و کیں میں، عداوت میں بے عدیل
نوجیں ہوں گر، تو مُنھ کو پھرائے نہ حرب سے
دل کیا، پہاڑ کانپتے تھے اس کی ضرب سے

تیغے کا وہ چڑھا ہوا پُٹھا کہ الاماں
بالائے دوش تھی کسی ٹانک کی کماں
پرخاش خو، مہیب نظر، اژدر دہاں
بدعت کا در، فریب کا گھر، مفسدِ زماں
افزوں تھا کید و مکر میں ابنِ زیاد سے
رگ رگ بھری ہوئی تھی عناد و فساد سے:

شرمندہ جس سے قیر، وہ چہرہ سیاہ رنگ
رسوائے زنگبار، سوادِ حبش کا ننگ
ماتھا بھی تنگ، ہاتھ بھی کوتاہ، دل بھی تنگ
قتّال، بد مزاج، سلح شور، خانہ جنگ
کس معرکے میں یہ دمِ حرب لڑا نہ تھا
پر ایسے شیر سے کبھی پالا پڑا نہ تھا

بولے یہ اُس سے حضرتِ عباسِ نیک خو — "اس گھاٹ پر بڑھا ہی ہمیں روکنے کو تو
اُن کو بھی ہاں بُلا، جو کھڑے ہیں کنارِ جو — دریا جو چھن گیا، تو رہے گی نہ آبرو
آتا ہے بے دھڑک کوئی یوں منھ پہ شیر کے
ثابت ہوا اجل تجھے لائی ہے گھیر کے

"اچھا ہوس ہو جو ترے دل میں، اُسے نکال — ہاں آزمودہ تر ہو جو حربہ، اُسے سنبھال
ہم منتظر کھڑے ہیں، کہیں ختم ہو جدال — تیغ و سپر اُٹھا کے دکھا اپنی چال ڈھال
تجھ کو ہے خوفِ جاں، ہمیں مرنے کی عید ہے
یاں انتظار موت سے بھی کچھ شدید ہے

"تجھ سا جوان اور نہ کرے کچھ خدا کا ڈر! — کانٹوں کا ساتھ گُل سے خلش، رہ نما سے شر!"
میزانِ عقل میں جو سبک تھا وہ خیرہ سر — گھوڑا بڑھایا نیزۂ خطّی کو تول کر
بڑھتے جو دیکھا بے ادبانہ دلیر کو
آیا جلال شیرِ الٰہی کے شیر کو

قبضے میں تھی کھنچی ہوئی شمشیرِ خوں چکاں — کوندی کہ الحفیظ، بڑھی وہ کہ الاماں!
برقِ غضب تھی ضربِ علمدارِ نوجواں — سُن ہو گیا جو سن سے چلی تیغِ جاں ستاں
پہلے ہی وار میں خطِ نصرت رقم ہوا
مثلِ خیار بیچ سے نیزہ قلم ہوا

خود سر نے ڈانڈ پھینک کے، قبضے میں لی کماں — گوشوں کو بڑھ کے، کاٹ گئی تیغِ بے اماں
نعرہ کیا "زہے ہنر، اے اژدرِ دماں! — سب یاں کے سرکشوں میں ہے تو صفدرِ زماں
چلّے بھی نادرست تھے، ترکش بھی دور تھا
تیری خطا نہیں، یہ کماں کا قصور تھا"

یہ سُن کے غیظ آگیا اُس بد مآل کو — دابا شقی نے اشہبِ صرصر مثال کو
کاندھے سے ہاتھ میں لیا لوہے کی ڈھال کو — چمکائی تیغ گھور کے حیدر کے لال کو
غصے میں لب پہ بے اَدَبانہ کلام تھے
آنکھیں تھیں، یا بھرے ہوئے دو خوں کے جام تھے

عباسِ نامور نے بھی جولاں کیا فرس — گردِ قدم کی جس کی ہوا کو رہی ہوس
وہ تھوتھنی، وہ آنکھ، وہ سینہ، وہ پیش و پس — تھا تازیانہ جس کے لیے رشتۂ نفس
جم کر اُڑا، تو نعلوں کی ضو تا فلک گئی
باگیں ذرا جو ہل گئیں، بجلی چمک گئی

مغفر کٹی کبھی، کبھی بکتر، کبھی سپر — چمکی یہ برق اِدھر، تو وہ بجلی گری اُدھر
سینے پہ آئی وہ، تو یہ پہنچی قریبِ سر — شانے سے وہ پھری، یہ چلی جانبِ کمر
سر سے بلند ہو کے جو تیغیں چمکتی تھیں
انساں تو کیا، فرشتوں کی آنکھیں جھپکتی تھیں

اِن کا فرس اِدھر تھا، تو اُس کا سمند اُدھر — گھوڑوں میں اس طرف تھے طرارے، زغند اُدھر
یہ ارجمند اِدھر تھا، تو وہ خود پسند اُدھر — لیکن اِدھر تو امن و اماں تھی، گزند اُدھر
گو وہ سیاہ رو بھی قوی ہے، دلیر ہے
پھر بھی تو کلب کلب ہے، اور شیر شیر ہے

گرمی میں ہانپنے جو لگا وہ سیہ دروں — فرمایا "دیکھ، ہے تری گردن پہ تیرا خوں
محتاجِ آب ہم ہیں، نہ چرخِ واژگوں — تو نے نکال دی ہے زباں، او سگِ زبوں!
شیر اب تجھے شکست سرِ دست دیتے ہیں
دو ہاتھ میں ترائی کو ہم چھین لیتے ہیں"

"اسپِ سرو جبد سے خبردار! ہوشیار! چلتا ہو اب کی دست علی ولی کا وار"
دابا ذرا، تو مل گیا گھوڑے سے راہوار بجلی گری، کہ سَن سے چلی تیغ آب دار
سر اُڑ گیا، سپر سے ہزار اُس نے آڑ کی
کٹ کر گری زمین پہ چوٹی پہاڑ کی

دو ہو کے مُنھ کے بھل جو گرا وہ ستم شعار بس سرنگوں گیا سوے دوزخ وہ نابکار
عبّاس سوے نہر بڑھے بہرِ کارزار نیزے اُٹھا اُٹھا کے یہ کہنے لگے سوار
"گو آپ کی بھی تیغ میں آفت کا کاٹ ہو
بڑھیے ذرا سنبھل کے، یہ تیغوں کا گھاٹ ہو"

اعدا جمے سنبھال کے ہتھیار، گھاٹ پر ڈھالیں نہیں گھٹا تھی دھواں دھار گھاٹ پر
آئی چمک کے برقِ شرر بار گھاٹ پر چلنے لگی دلیر کی تلوار گھاٹ پر
اعدا ہزار ڈھالوں میں منھ کو چھپاتے تھے
کیا وار تھے، کہ نار میں سر اُڑ کے جاتے تھے

وہ تیغ کھول دیتی تھی لوہے کا بھی حصار تھا اُس کے ہاتھ سے دلِ چار آئنہ فگار
اُڑتی تھیں مُنھ پہ تیغوں کے ایسے پُرے تھے وار خود اپنے سر پٹکتے تھے گر گر کے بار بار
غُل تھا وہی لڑے، جسے سر تن پہ بار ہو
آفت بپا ہو، کون اجل سے دوچار ہو

ڈر ڈر کے پچھلے پاؤں سپاہِ لعیں ہٹی یہ صف سوے یسار وہ سوے یمیں ہٹی
سر کے جبال، نہر کہیں سے کہیں ہٹی دہشت سے آسماں ہوا اونچا، زمیں ہٹی
بھاگڑ پڑی کہ ایک سے ایک آگے بڑھ گیا
دریا لہو کا کشتیِ گردوں پہ چڑھ گیا

گھاٹ پر پہنچنا

کاندھے پہ تیغ رکھ کے پکارا وہ رشکِ ماہ "کیوں! اور بھی ہے کوئی، جو روکے ہماری راہ؟"
دَب دَب کے گھاٹ چھوڑ گئی شام کی سپاہ پہنچا کچھار میں پسرِ ضیغمِ الٰہ
کی آہ خیمۂ شہِ والا کو دیکھ کر
آنسو بھر آئے آنکھوں میں، دریا کو دیکھ کر

اللہ ری جنگِ شیرِ نیستانِ کربلا چیونٹی بھی مورچوں میں نہ تھی، آدمی تو کیا
پہنچے جو گھاٹ پر، تو یہ اعدا کو دی صدا "کیوں اب یہ نہر کس کی ہے؟ اے قومِ اشقیا!
اک دم میں ہم شکست ہزاروں کو دیتے ہیں
دیکھو اسد ترائی کو یوں چھین لیتے ہیں

ڈالا میانِ نہر جو اسپِ صبا شتاب آنکھیں قدم سے ملنے لگے دوڑ کر حباب
موجیں بڑھیں برائے قدم بوسیِ جناب اُچھلیں علم کے چومنے کو ماہیانِ آب
لہروں کی بجلیاں جو برابر چمکتی تھیں
کھلتی تھیں، اور حبابوں کی آنکھیں جھپکتی تھیں

دو دن سے بے زباں پہ جو تھا آب و دانہ بند دریا کو ہنہنا کے لگا دیکھنے سمند
ہر بار کانپتا تھا، سمٹتا تھا بند بند چمکارتے تھے حضرتِ عباسِ ارجمند
تڑپاتا تھا جگر کو جو شور آبشار کا
گردن پھرا کے دیکھتا تھا مُنھ سوار کا

گرمی میں تشنگی سے کلیجا تھا آب آب تڑپا رہا تھا قلب کو موجوں کا پیچ و تاب
آجاتے تھے قریب جو ساغر بکف حباب کہتا تھا مُنھ کو پھیر کے وہ آسماں جناب
عبّاس! آبرو میں تری فرق آئے گا
پانی پیا تو نامِ وفا ڈوب جائے گا"

دریا سے بھر چکا وہ بہشتی جو مشکِ آب　　چلّایا فوج کو عمرِ خانماں خراب
"لو مشک لے چلا جگر و جانِ بوتراب　　سادات پر بس اب کبھی ہوں گے نہ فتح یاب
گر مشک تا خیام شہ نیکؑ خو گئی
یہ جان لو کہ جان گئی، آبرو گئی"

یہ اضطراب دیکھ کے عباس مسکرائے　　فرمایا "دیکھو! لڑکے کہاں سے کہاں ہم آئے
کس دبدبے سے جوہرِ تیغ علی دکھائے　　اب کچھ الم نہیں، اجل آئے کہ جان جائے
بس ہم نے گھاٹ چھین لیا، مشک بھر چکے
شیروں نے جو زباں سے کہا تھا، وہ کر چکے"

دریا سے مشک بھر کے جو نکلا وہ تشنہ کام　　اُمڈی سیہ گھٹا کی طرح سب سپاہِ شام
یوں ڈوب کر نکلتا تھا وہ آسماں مقام　　ظاہر ہو جیسے ابر میں چھپ کر مہِ تمام
موجیں تھیں رَدّ و ذیل کی، فوجوں کا دل نہ تھا
پر واہ رے حواس کہ ابرو پہ بل نہ تھا

چلتی تھی بڑھ کے چار طرف تیغِ برق دم　　کاندھے پہ مشکِ آب تھی، پنجے میں تھا علم
دامن سے لگ کے ہاتھ اُٹھتا تھا دم بہ دم　　کرتا تھا جا بجا تگ و دو اسپِ خوش قدم
اُڑ اُڑ کے برچھیوں جو اُترتا تھا کھیت میں
گھوڑے کے چاروں پاؤں دھر آتے تھے ریت میں

لشکر یزید کا تھا، کہ دریائے بے کنار　　پیدل جو گر پڑے، تو بڑھے جنگ کو سوار
بھاگے جدھر وہ، تو آئے کنارے پہ نیزہ دار　　نیزے قلم ہوئے، تو چلے برچھیوں کے دار
ہر سمت تیغ چلتی تھی اس دیں پناہ کی
کثرت مگر وہی تھی یزیدی سپاہ کی

شہادت

گھیرے تھے ایک جان کو دو لاکھ اہلِ شر — ٹھہریں کہاں، قرار کہاں، یہ، انھیں کدھر
چھاتی کے پاس برچھیاں، تیغیں قریبِ سر — پہلو میں اس طرف تو سنانیں، اُدھر تبر
ملتی نہ تھی اماں سپہ تیرہ بخت سے
گوشوں سے تیر چلتے تھے، پتّہ دِرخت سے

جب مشک کی طرف کوئی آتا تھا سن سے تیر — کہتے تھے یا حفیظ! کبھی گاہ یا قدیر!
چلا رہا تھا شمرِ جفا پیشہ و شریر — "بڑھنے نہ پائے لختِ دلِ شاہِ قلعہ گیر
رُخ اس جری کا خیمے کی جانب سے موڑ دو
ہاں برچھیوں سے شیر کے سینے کو توڑ دو"

سُن کر زباں درازیِ شمرِ ستم شعار — عباس مثلِ شیر جھپٹتے تھے بار بار
تلواریں سیکڑوں تھیں، ہزاروں تھے نیزہ دار — توڑی اگر یہ صف، تو جمی دوسری قطار
تنہا سنبھالے مشک و علم، یا وغا کرے
بلوہ ہو ساری فوج کا جس پر، وہ کیا کرے

مشہور ہے کہ ایک پہ بھاری ہیں دو بشر — پیاسے تھے ان کے خون کے دو لاکھ اہلِ شر
کھائے اِدھر سے زخم، جو کی اُس طرف نظر — کس کس کا وار رد کریں، دیکھیں کدھر کدھر
جب دم لیا تو سینے پہ سو تیر چل گئے
پہلو کو توڑ توڑ کے نیزے نکل گئے

زخمی تھے، پر فرس کو ڈپٹتے تھے بار بار — چہرے پہ زخم کھائے جھپٹتے تھے بار بار
بڑھ بڑھ کے غولِ فوج کے ہٹتے تھے بار بار — سر تن سے پانچ سات کے کٹتے تھے بار بار
دکھلا رہے تھے رنگ علی کی لڑائی کا
اعدا کے خوں سے لال تھا سبزہ ترائی کا

واحسرتا! وہ فوج کا بلوہ، وہ ایک جان
فاقہ وہ تین دن کا، وہ سوکھی ہوئی زبان
لڑنے کی فکر، مشک کا ڈر، علم کا دھیان
جی تن سے ہو گیا، کہیں کڑکی اگر کمان
چمکی سناں تو روح بدن سے رواں ہوئی
رُو کا سپر پہ تیر، تو خاطر نشاں ہوئی

برسے جو دس ہزار کمانوں سے تیر کیں
غربال ہو گیا تنِ عبّاسِ مہ جبیں
وار اپنا کر گیا جو برابر سے اِک لعیں
بالائے خاک کٹ کے گرا بازوئے یمیں
مُڑ کر نگاہ کی، کہ الٰہی یہ کیا ہوا
اِک ہاتھ رہ گیا تھا، سو وہ بھی جدا ہوا

گو ہاتھ کٹ گئے تھے، مگر کچھ نہ تھا ہراس
دانتوں سے جھک کے مشک کو پکڑا بہ درد و یاس
غم تھا، کہ گر پڑا علمِ شاہِ حق شناس
یہ رُعب تھا، کہ ڈر سے نہ آتا تھا کوئی پاس
آنکھیں لہو تھیں، رُخ سے جلال آشکار تھا
مشکیزہ تھا، کہ شیر کے مُنھ میں شکار تھا

ٹھکرا کے راہوار کو بڑھتے تھے واں جب
چھاتی پہ نیزے رکھ کے اُنھیں روکتے تھے سب
اِس پر بھی بڑھ چلا تھا وہ بے دست تشنہ لب
مارا کسی نے مشک پہ اِک تیر، ہے غضب!
آنکھوں سے بہہ کے اشک بصد یاس گر پڑے
پانی گرا تو گھوڑے سے عباس گر پڑے

اُٹھ کر جو فرطِ غیظ سے اعدا پہ کی نظر
مارا کسی نے تیر دلاور کی چشم پر
جھپکی نہ آنکھ، واہ رے دل، واہ رے جگر
تیور جو آئے، جھوم کے سنبھلا وہ نامور
جوشِ غضب میں خاک پہ بیٹھے تھے شیر سے
گویا لہو ٹپکتا تھا چشمِ دلیر سے

شانوں سے سارے جسم کا جب بہہ گیا لہو — ریتی پہ تھرتھرا کے جھکے آپ قبلہ رو
آواز دی کہ "آئیے یا شاہِ نیک خو! — سر تن سے کاٹ لینے کے درپے ہیں کینہ جو
خوں میں تڑپ تڑپ کے یہ غم خوار رہ نہ جائے
صدمہ یہ ہے کہ حسرتِ دیدار رہ نہ جائے"

اب یاں تو خاتمہ ہے، سوا اُس کے ذکا حال — خیمے میں غش ہے زوجۂ عباسِ خوش خصال
ڈیوڑھی پہ اہلِ بیت ہیں سب کھولے سر کے بال — پردے سے منہ نکالے ہیں اطفالِ خورد سال
لب اُن کے اودے اودے ہیں، منہ گورے گورے ہیں
آنکھوں میں اشک، ہاتھوں میں خالی کٹورے ہیں

کہتے ہیں سب لبوں پہ زبانوں کو پھیر کر — اب پانی لے کے آتے ہیں عباسِ نامور
حضرت سے پوچھتی ہے سکینہ بچشمِ تر — "میرے چچا کب آئیں گے، یا شاہِ بحر و بر!
کیا میں سفر کروں گی جہاں سے، تب آئیں گے؟"
بہلاتے ہیں حسین، کہ "بی بی! اب آئیں گے"

یہ ذکر تھا کہ فتح کے باجے بجے اُدھر — اُٹھے حسین ہاتھوں سے تھامے ہوئے جگر
چلائے بڑھ کے فوج سے دو چار اہلِ شر — "حضرت کہاں ہیں؟ مر گئے عباسِ نامور
کیا کیا چلی ہیں تیغوں پہ تیغیں لڑائی میں
وہ زخم کھائے شیر تڑپتا ہے ترائی میں"

پیری میں پہنچی جو خبرِ مرگِ نوجواں — ریتی پہ تھرتھرا کے گرے شاہِ انس و جاں
نکلیں سروں کو پیٹتی خیمے سے بی بیاں — تھا خانۂ علی میں تلاطم کہ الاماں
یوں گھر اُلٹ پلٹ تھا امامِ حجاز کا
جس طرح ٹوٹ جاتا ہے لنگر جہاز کا

دریا پہ سر برہنہ شہِ بحر و بر چلے — صدمہ یہ تھا، کہ ہاتھوں سے تھامے کمر چلے
اکبر سنبھالے باپ کو با چشمِ تر چلے — یہ بھی چلے اُدھر، شہِ والا جدھر چلے
صدمہ ہو ضربِ غم سے دلِ پاش پاش پر
رونے کو بھائی جاتا ہے بھائی کی لاش پر

پہنچے ترائی میں جو شہِ دیں بصد تعب — سقائے اہلِ بیت نظر آیا جاں بہ لب
بازو کٹے تھے، خون میں ڈوبا تھا جسم سب — دم توڑتے تھے ہچکیاں لے لے کے، ہے غضب!
آنکھوں سے نزع میں بھی رواں جوئے اشک تھی
پر خوں علم پہ ہاتھ تھا چھاتی پہ مشک تھی

چلائے گر کے لاش پہ شبیرِ نامدار — "بھیا! تمھاری نرگسی آنکھوں کے میں نثار
اس نزع میں بھی تھا تمھیں بھائی کا انتظار — آنکھیں پھرا کے ڈھونڈھتے ہو ہم کو بار بار
شاید زباں ہے بند، جواب کھولتے نہیں
روتے ہوئے ہم آئے، تو تم بولتے نہیں"

اکبر نے عرض کی کہ "چچا جان مر گئے" — جھک کر پکارے شاہ کہ "بھیا کدھر گئے؟
منہ تو اُٹھاؤ، خاک سے رخسار بھر گئے — وا حسرتا! حسین کو بے آس کر گئے
اب کون دے گا دکھ میں نبی کے پسر کا ساتھ؟
دم بھر میں تم نے چھوڑ دیا عمر بھر کا ساتھ

"بھائی سے ساتھ بھائی کا چھوٹا ہزار حیف! — بازو مرا قوی تھا، سو ٹوٹا ہزار حیف!
اُمت نے میرے باغ کو لوٹا ہزار حیف! — چھوٹا نہ پھل، نہ پھول، نہ بوٹا ہزار حیف!
فریاد ہے، لعینوں نے کیسا ستم کیا
تیغوں سے سروِ باغِ علی کو قلم کیا"

لائے علم کو خیمے میں سلطانِ بحر و بر　　رایت کے ساتھ ساتھ تھے بچے برہنہ سر
دیکھا جو اُس علم کا پھریرا لہو میں تر　　سیدانیاں زمیں پہ گریں تھام کر جگر
سر پیٹتی تھی کوئی، کوئی خاک اُڑاتی تھی
ہی ہی کا شور تھا، کہ زمیں تھرتھراتی تھی

پُرخوں علم کے پاس تھے عباس کے پسر　　تکمے کھلے تھے کرتوں کے، تھرّاتے تھے جگر
ماں نے جو طوق اُتارے تھے اور کان کے گہر　　سہما ہوا تھا ایک، تو اک پیٹتا تھا سر
زلفوں پہ خاک تھی، تو رُخوں پر غبار تھا
چہروں سے دردِ بے پدری آشکار تھا

اللہ رے دل خراشی علی کی بہو کے بین!　　سکّانِ آسمان و زمیں کو بھی تھا نہ چین
چادر پڑی تھی مُنہ پہ، کہ تھے سامنے حسین　　تھامے تھی ہاتھ خواہرِ سلطانِ مشرقین
ٹکڑے تھے تیغِ غم سے دلِ سوگوار کے
حکمِ حیا یہ تھا، کہ نہ رُو نا پکار کے

کچھ سوچ کر جو ہٹ گئے واں سے امامِ دیں　　اُس وقت ہاتھ اُٹھا کے علم کی بلائیں لیں
مُنہ کر کے سوئے نہر پکاری وہ دل حزیں　　”صاحب! حسین روتے ہیں، تم کو خبر نہیں
جنگل بسا دیا شہِ والا کو چھوڑ کے
صاحب! کدھر چلے گئے آقا کو چھوڑ کے؟

”صاحب! سکینہ جان بلکتی ہیں، آئیے　　کانٹے زباں کے دیکھ کے آنسو بہائیے
صدقے گئی، بھتیجی کو پانی پلائیے　　قربان جاؤں، مشک بھری ہو تو لائیے
الفت کے، دل دہی کے منافی نہ چاہیے
صادق ہیں آپ، وعدہ خلافی نہ چاہیے“

غل تھا، کہ خوں میں بھر گیا سقائے اہل بیت
دُنیا سے کوچ کر گیا سقائے اہل بیت
ہم لُٹ گئے، گزر گیا سقائے اہل بیت
فریاد ہے کہ مر گیا سقائے اہل بیت
خم تھے، گرا تھا کوہ مصیبت حسین پر
ماتم تھا بی بیوں میں سکینہ کے بین پر

یارب! جہاں میں بھائی سے بھائی جُدا نہ ہو
دشمن بھی اس بلا میں کوئی مبتلا نہ ہو
بازو کے ٹوٹنے کی کسی پر جفا نہ ہو
مرجائے خود، پہ یہ الم جاں گزا نہ ہو
تاب و تواں کہاں رہے، بازو اگر نہ ہو
لیٹے جو قبر میں بھی، تو سیدھی کمر نہ ہو

———•═══•———

علیؑ اکبر کا جہاد

تعلّی
جوہر کشاے تیغ زباں ہی سخن مرا
گُل ہاے نظم سے ہی شگفتہ چمن مرا
یکتا گہر ہیں شعر، صدف ہی دہن مرا
سب سے جدا ہی رنگ، نیا ہی چلن مرا
لطفِ بیان و حسنِ کلام آشکار ہی
یہ وہ چمن ہی جس میں ہمیشہ بہار ہی

ذہنِ رسا کا عرشِ بریں پر دماغ ہی
گُل کی طرح کھلا ہی جو سینے میں داغ ہی
روشن جو عمر بھر رہے، یہ وہ چراغ ہی
باغ جناں کو رشک ہو جس پر وہ باغ ہی
یہ باغِ نظم گلشنِ عالم میں فرد ہی
اس جا نگار خانۂ مانی بھی گرد ہی

تمہید
ذکرِ وغاے سروِ ریاضِ امام ہی
یہ پھول روحِ دلبرِ خیر الانام ہی
خوش رو ہی، خوش جمال ہی، شیریں کلام ہی
گرمی ہی تین روز کہ وہ تشنہ کام ہی
صرفِ خزاں ہی باغ شہ لاجواب کا
گرمی سے جل رہا ہی جگر آفتاب کا

لکھتا ہوں حال بانوے بیکس کے لال کا
تازہ ابھی شباب ہی اس نونہال کا
شہرہ ہی حُسنِ اکبرِ یوسف جمال کا
ماں باپ کا ریاض ہی اٹھارہ سال کا
بے مثل ہی جو گل چمنِ روزگار میں
وہ پھول توڑتی ہی اجل کس بہار میں

یارب! کوئی جہاں میں اسیرِ محن نہ ہو — جنگل میں گھر لٹا کے کوئی بے وطن نہ ہو
ماں باپ سے جدا کوئی گُل پیرہن نہ ہو — پھولا پھلا اجاڑ کسی کا چمن نہ ہو
بھائی بچھڑ چکا ہے شہِ مشرقین سے
اب نوجواں پسر کی ہے رخصت حسین سے

مرنا جوان بھائی کا اور اُس پہ یہ ستم — پُرسا، نہ دل دہی، نہ تشفی، نہ دردِ غم
اعدا صفیں جمائے ہوئے جنگ پر بہم — ہنستے تھے سوگواروں کے رونے پہ دم بدم
نرغے میں اُن کے سبطِ رسالت پناہ تھا
مشرب میں جن کے پانی کا دینا گناہ تھا

بجتا تھا واں سپاہ میں نقارۂ ظفر — ماتم تھا نوجوانیِ عباس کا ادھر
بیٹھے تھے فرشِ خاک پہ سلطانِ بحر و بر — اکبر کھڑے تھے سامنے چپکے جھکائے سر
پاسِ ادب سے شاہ سے کچھ کہہ نہ سکتے تھے
چہرہ تھا سرخ، آنکھوں سے آنسو ٹپکتے تھے

اعدا پکارتے تھے کہ "یا شاہِ دیں پناہ! — باقی ہے کوئی اور؟ کہ بس ہو چکی سپاہ
عباس سا تو اب کوئی ہوگا نہ خیر خواہ — بھیجو کسی کو جلد، کہ ہم دیکھتے ہیں راہ
چُننے دو گُل پسر کو شہادت کے باغ سے
کب تک بچائیے گا کلیجے کو داغ سے

یزیدیوں کا طعن و طنز۔

"دُنیا سے کوچ کر گئے عباسِ نامدار — اَب بے چراغ ہے لحدِ شیرِ کردگار
حضرت کا صبر و شکر ہے عالم پہ آشکار — مثلِ خلیل کیجیے فرزند کو نثار
آہیں نہ بھریے، پیٹ کے سر کو نہ رُو دیجے
جب جانیں ہم، کہ کھو کے پسر کو نہ رو دیجے

"بھائی کا داغ اور ہے، داغِ پسر ہے اور — بازو کا درد اور ہے، دردِ کمر ہے اور
قوت بدن کی اور ہے، نورِ نظر ہے اور — سینے کا زخم اور ہے، زخمِ جگر ہے اور
گر صبر ہے، تو گود کے پالے کو بھیجیے
نیزوں میں، اپنے گیسوؤں والے کو بھیجیے

"اُس کو بچائیے، تو وغا کو خود آئیے — حیدر کی ذوالفقار کے جوہر دکھائیے
زخمِ سنان و خنجر و شمشیر کھائیے — گرمی بڑی ہے، آج لہو میں نہائیے
آمادہ ہم تو دیر سے بہرِ ستیز ہیں
تیغیں بھی ہیں اُپی ہوئی، خنجر بھی تیز ہیں

"وہ کاٹے ہیں جس نے بازوئے بختِ دلِ امیر — ہے خوب آبدار وہ شمشیرِ بے نظیر
چھیدا ہے جس نے مشک کو موجود ہے وہ تیر — یہ گرز وہ ہے، ضرب سے جس کی ہوئے اخیر
تڑپے تھے جس سے مشک کو دانتوں سے چھوڑ کے
برچھی یہ ہے جو نکلی تھی پہلو کو توڑ کے

"صابر بڑے ہیں آپ تو یا شاہِ انس و جاں — اِک بھائی کے فراق میں یہ نالہ و فغاں!
رونے سے جی اُٹھیں گے نہ عباسِ نوجواں — حضرت پکارتے ہیں کسے؟ بھائی اب کہاں؟
ملتا ہے کب جہاں میں بھلا، جو گزر گیا
اب فکر اپنی کیجیے، وہ شیر مر گیا"

حضرت علی اکبر کا غصہ

اکبر نے کی غضب کی نظر سوئے فوجِ شام — کانپے یہ غیظ سے کہ اُگلنے لگی حسام
کی عرض ہاتھ جوڑ کے "اے قبلۂ انام! — سنتے ہیں آپ لشکرِ اعدا کے یہ کلام؟
خوں تن میں جوش کھاتا ہے ہنگامِ جنگ ہے
مولا! بس اب تو حوصلۂ صبر تنگ ہے

"اُن کے کلام سننے کی کس کے جگر میں تاب
خادم زباں تیغ سے دے گا انھیں جواب
کیا اپنے دل میں سمجھے ہیں یہ خانماں خراب
نعرہ کروں تو شیر کا زہرہ ہو آب آب
آدابِ شاہ سے نہیں، ہم بول سکتے ہیں
زخمِ جگر پہ اب تو نمک یہ چھڑکتے ہیں

"ہم کو یہ طعن و طنز کی باتیں نہیں پسند
کوفے میں لیں گے دم، جو اُٹھائیں گے پھر سمند
ہونٹوں پہ غم سے اب ہے یہاں جان دردمند
کاٹیں تبر سے، تیغ سے، خنجر سے بند بند
ہنس ہنس کے جسم پر تبر و تیر کھائیں گے
تیغِ زباں کے زخم اُٹھائے نہ جائیں گے"

امام حسین سے رخصت

حضرت نے مسکرا کے نظر کی سوئے پسر
نعلینِ عرش سا پہ جھکایا پسر نے سر
فرمایا "کیا ارادہ ہے اے غیرتِ قمر؟"
کی عرض "اذن دیجیے یا شاہِ بحر و بر!
عباس کے فراق نے مارا غلام کو
بس اب نہیں ہے صبر کا یارا غلام کو"

شہ نے کہا "تمھیں مرے دل کی نہیں خبر
پیارے کہاں سے لاؤں میں اس طرح کا جگر
ہے باپ کا عصائے ضعیفی جواں پسر
جب تم نہ ہو گے پاس، تو مر جائے گا پدر
کیونکر جدا نگاہ سے بیٹا کریں تمھیں
آنکھیں یہ چاہتی ہیں کہ دیکھا کریں تمھیں

"پھولو پھلو، کہ زینتِ باغِ جہاں ہو تم
آخر ہے عمر، پیر ہیں ہم، نوجواں ہو تم
شاداں رہے گی روح، کہ راحت رساں ہو تم
مرنے کے بعد باپ کا نام و نشاں ہو تم
گر ہم نہیں، تو خانۂ زہرا میں تم رہو
اب زندگی یہی ہے، کہ دنیا میں تم رہو"

اکبر کا رنگ اُڑ گیا سنتے ہی یہ کلام — کی عرض ہاتھ جوڑ کے شہ سے کہ "یا امام!
فرزندِ ارجمند ہیں سجادِ نیک نام — اکبر تو ہے حضور کا اَدنیٰ سا اک غلام
اس امر سے فرزند کو کوئی شرمندگی نہیں
آقا کے بعد موت ہے یہ زندگی نہیں

"بندے ہزار ہم سے نثارِ سرِ حضور — دُنیا ہو، اور آپ ہوں، اے کبریا کے نور!
روشن جو ہے جہاں، یہ اسی دَم کا ہے ظہور — ذرہ ہر اک ہے نور، قدم سے چراغِ طور
ظلمت زُدائے خلق شہِ دیں کی ذات ہے
دُنیا میں آفتاب نہ ہو جب، تو رات ہے

"رونق زمیں کی ہے، کہ امامِ زماں ہیں آپ — سایہ ہے جس کا عرش پہ، وہ آسماں ہیں آپ
بحرِ جہاں میں باعثِ امن و اماں ہیں آپ — شیرازۂ صحیفۂ کون و مکاں ہیں آپ
فردوں کی ابتری ہے، جو دفتر کشا نہ ہو
کیونکر تھمے جہاز، اگر ناخدا نہ ہو

"افضل ہے کون سبطِ رسالت مآب سے؟ — دُنیا میں ہے، تو یہ برکت ہے جناب سے
سرسبز ہے زراعتِ عالم سحاب سے — ذرّوں کی زندگی ہے فقط آفتاب سے
چھٹ کر پدر سے باپ کے پیارے کہاں رہیں
جب آسماں نہ ہو، تو ستارے کہاں رہیں

"دم سے حضور کے ہے غلاموں کی ہست و بود — مولا ہیں آپ، ہم جہاں میں، درِ رحمت و دود
اے چشمۂ عطا و کرم! بحرِ فیض و جود! — دریا اگر نہ ہو، تو حبابوں کی کیا نمود
سب خلق شاہِ دیں سے طلب گارِ عون ہے
جب نوح غرقِ خوں ہو، تو کشتی کا کون ہے؟"

شہ نے کہا کہ "خوش ہے بہر حال خاکسار — تم سے جو سو پسر ہوں، تو اس راہ میں نثار
پر میں نہ دوں گا رخصتِ میدانِ کارزار — اس امر میں تمھاری پھپھی کو ہے اختیار
راضی ہوں وہ، تو داغ انھیں دے کے جائیے
پالا ہے جس نے، اس سے رضا لے کے جائیے

"سب جانتے ہیں، جو ہے پھپھی کو تمھاری چاہ — معلوم ہوگا، جاؤ گے جب سوے خیمہ گاہ
باہیں گلے میں ڈالے گی زینبؑ بہ اشک و آہ — قدموں پہ گر کے آپ کی ماں ہوگی سدِّ راہ
یہ مرحلہ بھی کم نہیں زنجیر و طوق سے
دونوں رضا جو دیں، تو چلے جاؤ شوق سے"

ماں سے رخصت

با چشمِ نم چلے علی اکبر سوے خیام — کانپا یہ دل کہ بیٹھ گئے خاک پر امام
روتا ہوا جو ڈیوڑھی سے آیا وہ نیک نام — دوڑی پسر کو دیکھ کے بانوے تشنہ کام
دامن سے آ کے بالی سکینہ چمٹ گئی
زینب بلائیں لے کے گلے سے لپٹ گئی

ماں گرد پھر کے بولی کہ "اے میرے گل عذار! — تم صبح سے گئے تھے، اب آئے، یہ ماں نثار
در پر تڑپ تڑپ کے میں جاتی تھی بار بار — کھولو بس اب کمر، کہ مرا دل ہے بے قرار
گرمی یہ اور قحط کئی دن سے آب کا
رخ تمتما گیا ہے مرے آفتاب کا

"تر ہے قبا پسینے میں، پنکھا کوئی بلاؤ — سنولا گئے ہو دھوپ میں، واری ہوا میں آؤ
جھاڑوں ردا سے گرد میں زلفوں کی، بیٹھ جاؤ — گھٹ جائے گا لہو مرا، آنسو نہ تم بہاؤ
صدقے جو دل پہ ہو، اسے کچھ منہ سے کہتے ہیں
کیا ہے؟ جو اشک نرگسی آنکھوں سے بہتے ہیں

"صغرا کی تو وطن سے کچھ آئی نہیں خبر؟ جلدی کہو، کہ مُنہ سے نکلتا ہے اب جگر"
اکبر نے عرض کی کہ "ہیں سب خیر سے مگر لُٹتا ہے کوئی آن میں خیر النسا کا گھر

ملتی نہیں رضا ہمیں، آنسو بہاتے ہیں
بابا گلا کٹانے کو میداں میں جاتے ہیں

"اس وقت کس سے درد دل اپنا کہوں میں آہ تم بھی ہو سدِ راہ، پھوپھی بھی ہیں سدِ راہ
چھائی ہے واں گھٹا کی طرح شام کی سپاہ اماں! مدد کرو، کہ کمر باندھتے ہیں شاہ

اب زندگی ہے تلخ، بہت تنگ ہیں جان سے
الفت نے آپ کی ہمیں کھویا جہان سے

"دیتے نہیں رضا جو امامِ فلک اساس خاطر فقط یہ آپ کی ہے اور پھوپھی کا پاس
اب غیر یاس کوئی نہیں اُن کے آس پاس ناطاقتی ہے، ضعف ہے، صدمہ ہے، اور پیاس

کیونکر رہیں گے وہ، کہ سراپا ضعیف ہیں
پیری میں دل ضعیف ہے، اعضا ضعیف ہیں

"عباس جب سے مر گئے، روتے ہیں دم بہ دم رُخ زرد ہے، کماں کی طرح ہو گئے ہیں خم
چلّوں میں تیر جوڑے ہیں واں بانیِ ستم قرباں ہوں کس طرح بہ سرِ فاطمہ پہ ہم

سب یہ کہتے ہیں، رن کی طرف جائیں کس طرح؟
ماں کو، پھوپھی کو، بہنوں کو سمجھائیں کس طرح؟"

دیکھی گئی نہ ماں سے یہ بے تابیِ پسر وارث کی بے کسی پہ لگا کانپنے جگر
ہاتھوں سے دل کو تھام کے بولی وہ نوحہ گر "دولت پہ فاطمہ کی تصدق تمام گھر

پہلے نہ کچھ کہا تھا، نہ اب روکتی ہوں میں
روتے ہو کس لیے؟ تمھیں کب روکتی ہوں میں

"زہرا کے لال پر مرے ماں باپ نثار — عابد نثار، اصغر تشنہ جگر نثار
جانیں ہزار ہوں تو فدا، لاکھ سر نثار — قربان گھر، کنیز تصدق، پسر نثار
کسرائی گو کہ ہوں، پہ بہو میں علی کی ہوں
مانگو گے جو وہ دوں گی، کہ باندی سخی کی ہوں

"مجھ پر حوالہ کرتے ہیں گر شاہ خوش خصال — رخصت نہ تم کو دوں، یہ بھلا ہے مری مجال!
صدقے انھیں کا ہے، کہ پلا تم سا نونہال — رخصت کا صدقے جاؤں، پھپھی سے کرو سوال
ہم سب کنیزیں بنت امیر عرب کی ہیں
صغرا ہو یا کہ تم، وہی مختار سب کی ہیں

"کہنے کو یوں ہیں چاہنے والے تمھارے سب — لیکن ہے ان کے عشق سے نسبت کسی کو کب
دن کو انھوں نے دن کبھی جانا، نہ شب کو شب — لیجے انھیں سے، آپ کو جس شے کی ہے طلب
مجھ سے نہ کچھ، نہ سید عالی سے پوچھیے
گر پوچھیے تو پالنے والی سے پوچھیے

پھپھی سے رخصت

روتے ہوئے گئے علی اکبر پھپھی کے پاس — دیکھا کہ غش پڑی ہے زمیں پر وہ حق شناس
زانو پہ سر لیے ہوئے گھبرا کے بے حواس — اس حال میں بھی لب پہ یہی ہے کلام یاس
"اب تاب طاقت جسد روح و دل گئی
کیوں صاحبو! رضا علی اکبر کو مل گئی؟

"اکبر سے مجھ کو یہ نہ توقع تھی، ہے غضب! — اتنا نہیں خیال، کہ ہے کون جاں بلب
اس گل نے ہائے میری ریاضت بھلائی سب — نام خدا جوان ہوئے، کیا ہم سے کام اب
پھر ماں کے شوق میں، رخصت کے دھیان میں
سچ ہے کسی کا کون ہوا ہے جہان میں

"یا بے ہمارے چین نہ آتا تھا کوئی دم — مالک اب اور ہو گئے، کوئی ہوئے نہ ہم
کیا دخل تھا کہ ڈیوڑھی سے باہر رکھیں قدم — ہے ہے وہ میرا دردِ مصیبت، وہ رنج و غم!
جاگی ہوں میں جو چونک کے راتوں کو روئے ہیں
پوچھو تو، کس کی چھاتی پہ بچپن میں سوئے ہیں

"کنگھی کسی کے ہاتھ کی بھاتی نہ تھی کبھی — بے میرے لیٹے نیند انھیں آتی نہ تھی کبھی
بے اِن کے ماں کی قبر پہ جاتی نہ تھی کبھی — روئیں پسر، پہ ان کو رُلاتی نہ تھی کبھی
میرے سوا کسی کو کبھی جانتے نہ تھے
جو تھی سو میں تھی، ماں کو تو پہچانتے نہ تھے

"بچپن میں تھا نہ ہم سے زیادہ کسی کا پیار — اب کیا غرض، گزر گئی وہ فصل، وہ بہار
بھیگیں مسیں، نمود ہوا سبزۂ عذار — مالک ہیں خود، بھلا مرا اب کیا ہے اختیار
ثابت ہوا اُدھر سے اُدھر مرنے جائیں گے
میں مر بھی جاؤں گی، تو وہ یاں تک نہ آئیں گے

"باہر سدھارے یا ابھی ہیں ماں سے کچھ کلام؟ — بھابی نے کیوں لیا تھا ابھی رُک کے میرا نام؟"
سینے پہ منھ کو رکھ کے یہ بولا وہ لالہ فام — "آنکھیں تو آپ کھولیے، حاضر ہے یہ غلام
خادم جدا نہ تھا شہِ گردوں سریر سے
کس جرم پر حضور خفا ہیں حقیر سے؟

"کیا ہے قصور؟ جس پہ یہ غصہ ہے یہ عتاب — کرتا ہوں بات میں کوئی بے مرضیِ جناب؟
روتا ہوں اب، کہ صبر کی مجھ کو نہیں ہے تاب — شکوہ یہ خاکسار کا! اَے بنتِ بوتراب!
ہر دکھ میں، ہر بلا میں مددگار آپ ہیں
پالا ہے مجھ کو، مالک و مختار آپ ہیں

"پیدا ہوا، تو آپ کی صحبت مجھے ملی
کرتی ہو روح شکر، وہ راحت مجھے ملی
یوسف کو کب ملی تھی، جو دولت مجھے ملی
رکھا عزیز آپ نے، عزت سب مجھے ملی
صدقہ ہے اس قدم کا جو سر تا فلک گیا
کی مہر آفتاب نے، ذرّہ چمک گیا

"مرضی نہ ہو، تو رن کو بھی جائے نہ یہ غلام
بندے ہیں، ہم، اطاعتِ مالک سے ہم کو کام
تکرار کی مجال، نہ اصرار کا مقام
مرتے اگر، تو اس میں بھی تھا آپ ہی کا نام
روتی ہیں آپ کس لیے؟ اچھا نہ جائیں گے
پر یاد رکھیے، منہ نہ کسی کو دکھائیں گے"

یہ کہہ کے جھک گیا جو قدم پر وہ ذی وقار
بس ہو گئیں محبتِ قلبی سے بے قرار
پھیلا کے دونوں ہاتھوں کو اُٹھیں بحالِ زار
شکوے کے بدلے مُنہ سے یہ نکلا "میں نثار"
اُمڈا یہ دل، کہ چشم کے ساغر چھلک پڑے
دیکھا جو آفتاب کو آنسو ٹپک پڑے

لے کر بلائیں بولیں کہ "واری خفا نہ ہو
صدقے ہو تم پہ جان ہماری، خفا نہ ہو
باتیں تھیں یہ تو پیار کی ساری، خفا نہ ہو
روٹھتے ہو کیوں؟ منگا دو سواری، خفا نہ ہو
آئے بلا حسین پہ جو، اُس کو رد کرو
اچھا سدھارو، دُکھ میں پدر کی مدد کرو"

الفت کے جوش میں تو یہ منہ سے کہا مگر
اُٹھا یہ دل میں درد، کہ تھرا گیا جگر
اکبر کو روتے دیکھ کے بولی وہ نوحہ گر
"کیا ماجرا ہوا؟ مجھے مطلق نہیں خبر
میں دکھنے نہ پائی، کہ وار اُن کا چل گیا
کیا میں نے کہہ دیا؟ کہ کلیجہ نکل گیا

"میں ہوش میں تھی، یہ قدم پر گرے تھے جب — میں بھی کہوں، یہ پاؤں پہ گرنے کا کیا سبب
وجہ یہ اب کھلا، کہ یہ رخصت کی تھی طلب — اکبر کو میں نے ہاتھ سے کھویا تھا، ہے غضب!
کچھ بھی خبر نہیں، مرے دلبر نے کیا کہا
میں نے جواب کیا دیا، اکبر نے کیا کہا

"کیا کہہ دیا تھا مرنے کو جائے یہ گل بدن؟ — راضی ہوئی تھی میں کہ خزاں ہو مرا چمن؟
بے خود ہوں، جب سے رن میں سدھارے شہِ زمن — کہتی ہوں کچھ، زباں سے نکلتا ہے کچھ سخن
اتنی خبر نہیں علی اکبر کے پیار میں
قابو میں ہے نہ دل، نہ زباں اختیار میں

"زندوں میں ہوتی گر، تو یہ کہتی کہ مر نہ جائیں — اس پیاس میں شہید ہوں، فاقوں میں زخم کھائیں؟
اٹھارواں برس ہے، دلھن تو مجھے دکھائیں — پالا ہے منتوں سے، مرادیں مری بر آئیں
مرتی ہوں اشتیاق میں سہرا تو دیکھ لوں
سہرے کے نیچے چاند سا چہرا تو دیکھ لوں

"رخصت کے نام سے مرا پھٹتا ہے اب جگر — ایسا نہ ہو کہ بانوئے بےکس کو ہو خبر
گر سُن لیا، تو دل میں کہے گی وہ نوحہ گر — پیارا ہوا نہ بنتِ علی کو مرا پسر
سمجھی نہیں کیا؟ جو دی اُسے رخصت جدال کی
زینب نے ہائے! قدر نہ کی میرے لال کی

"سچ ہے کہ اُس کی چاہ سے نسبت مجھے کہاں — ہوں لاکھ اُن کی چاہنے والی، وہ پھر ہے ماں
آنکھوں کا نور، قلب کی طاقت، بدن کی جاں — آنچ آتما کی ہے وہ قیامت، کہ الاماں
دیں ماں کا ساتھ، نام خدا اب جوان ہیں
میرا ہے جب یہ حال، پھر اُس کی تو جان ہیں"

جس دم سُنے یہ دور سے بانو نے سب کلام — آئی قریب حضرتِ زینب وہ نیک نام
کی عرض ہاتھ جوڑ کے "اے خواہرِ امام! — میں ہوں کنیز آپ کی، اور یہ پسر غلام
کس کی مجال ہے، جو کہے گا، یہ کیا کیا
بی بی نے دی غلام کو رخصت، بجا کیا

"لونڈی ہے فاطمہ کی کنیزوں میں باوفا — ہو قطع وہ زباں، جو کرے آپ کا گلا
حضرت کو اِن کے سر پہ سلامت رکھے خدا — مالک ہیں آپ، اس میں کسی کو ہے دخل کیا
یہ کچھ جائے گفتگو ہے نہ ماں کو، نہ باپ کو
ہے دخل اذن دینے نہ دینے کا آپ کو

"آپ اُس کی ماں ہیں، آپ کا فرزند ہے یہ لال — دخل اس معاملے میں کوئی دے، یہ کیا مجال
یہ عازمِ جدال ہے، اور آپ کا یہ حال — قدموں کو چھوڑتا نہ کبھی یہ نکو خصال
آپ اس کو چاہتی ہیں، یہ صدقے ہے آپ پر
پر کیا کرے، کہ آج مصیبت ہے باپ پر

"قسمت بُری ہے، اس میں کسی کا قصور کیا — اچھا، رہیں کہ جائیں، ہمارا بھی ہے خدا
پروا ہماری ہے، نہ خیال اِن کو آپ کا — تابع ہم آپ کے بھی ہیں، ان پر بھی ہیں فدا
عابد ہوں، یا کہ یہ، سبھی آنکھوں کے تارے ہیں
پر اب تو یہ نہ آپ کے ہیں، نہ ہمارے ہیں"

یہ ذکر تھا، کہ آئے شہنشاہِ بحر و بر — لے لیں بلائیں بھائی کی زینب نے دوڑ کر
بانو بھی روئی شہ کے قدم پر جھکا کے سر — بولی لپٹ کے بالی سکینہ کہ "اے پدر!
سنتی تھی میں، کہ رن سے علمدار آتے ہیں
لو اب تو گھر سے نہر پہ بھیا بھی جاتے ہیں"

ہاتھوں کو جوڑ کر علی اکبر نے عرض کی   "اماں نے بھی رضا ہمیں دی، اور پھپھی نے بھی
زہرا کی وہ بہو ہیں، تو یہ دخترِ علی   آقا! سوال رد نہیں کرتے کبھی سخی
رُویا جو میں، تو ماں نے گلے سے لگا لیا
مرنے کا اِذن دے کے پھپھی نے جلا لیا"

آنسو بہا کے کہنے لگے شاہِ نیک ذات   "حقا کہ ہیں وہ بی بیاں ایسی ہی خوش صفات
دُنیا میں یوں لُٹائے کوئی ایسی کائنات   ان کی محبتیں میں نہ بھولوں گا تا حیات
کیونکر نہ ہو، کہ دونوں میں خو ہے بتول کی
بیٹی ہے ایک، ایک بہو ہے بتول کی"

تسلیم کر کے خیمے سے وہ سیم بر چلا   پیچھے حرم کا قافلہ سب ننگے سر چلا
بانو پکارتی تھی، کہ "پیارا پسر چلا"   چلاتی تھی پھپھی، "مرا لختِ جگر چلا
لُٹتے ہیں اہلِ بیت، دہائی امام کی
تصویر گھر سے جاتی ہے خیر الانام کی"

بھائی کے غم سے عابدِ مضطر تھے بے قرار   اُٹھتے تھے، اور زمیں پہ گرتے تھے بار بار
بہنیں پکارتی تھیں کہ "بیرن! ترے نثار"   سینوں کو پیٹتی تھیں خواصیں بحالِ زار
اِک حشر تھا، جُدا علی اکبر جو ہوتے تھے
جھولے میں پھوٹ پھوٹ کے اصغر بھی روتے تھے

ہلتا تھا خیمہ، رانڈوں میں تھی یہ ہڑادھڑی   آہوں کی بجلیاں تھیں، تو اشکوں کی تھی جھڑی
کوئی اِدھر کو غش تھی، کوئی تھی اُدھر پڑی   آفت کا وقت تھا، تو قیامت کی تھی گھڑی
ماتم تھا یہ حسین کے تازہ جوان کا
جاتا ہے جیسے گھر سے جنازہ جوان کا

نکلا حرم سرا سے جو وہ نورِ حق کا نور
خادم نے دی صدا، کہ "برآمد ہوئے حضور"
حضرت کھڑے تھے خیمے کی ڈیوڑھی سے کچھ جو دور
دستِ ادب کو جوڑ کے بولا وہ ذی شعور
"رخصت ہوں اب، جو حکمِ شہِ نامدار ہو"
رو کر کہا حسین نے "اچھا، سوار ہو"

یہ کہہ کے خود سوار کیا نورِ عین کو
کس صبر سے ادا کیا خالق کے دین کو
روتا اُس آفتاب نے چھوڑا حسین کو
روشن ضیائے رُخ نے کیا مشرقین کو
قدسی دُرود پڑھتے تھے چہرے کے نور پر
گھوڑے پہ آپ تھے، کہ تجلّی تھی طور پر

وہ شوخیاں سمندِ فلک سیر کی، وہ چال
پیلِ دماں کہیں، کہیں ضیغم، کہیں غزال
مرکب جو بے عدیل، تو راکب بھی بے مثال
رعب و نہیب و دبدبہ و سطوت و جلال
بجلی کی زرق برق تھی سازِ دیراق پر
غُل تھا، چڑھے ہیں احمدِ مرسل براق پر

صحرا کو شمعِ حسن نے تابندہ کر دیا
جو مُردہ دل تھے دم میں اُنھیں زندہ کر دیا
ذرّوں کو آفتاب درخشندہ کر دیا
گردوں کو اُس زمین نے شرمندہ کر دیا
پایہ زمیں کا عرش سے ہم دست ہو گیا
جادے سے اوج کاہکشاں پست ہو گیا

ہے دھوم ذرّے ذرّے میں اس آفتاب کی
خوشبو ہے زلف و جسم میں مشک و گلاب کی
سرتا قدم ہے شان رسالت مآب کی
تصویر ہے رسول خدا کے شباب کی
گھوڑے کے گرد جن و ملک کا ہجوم ہے
"صلّوا علی النّبی" کی بیاباں میں دھوم ہے

وہ شان، وہ شکوہ، وہ اقبال، وہ جمال
گویا پئے جہاد چلے شیرِ ذوالجلال
گرمی سے تھا جو چاند سے چہرے کا رنگ لال
خورشید کو نہ آنکھ ملانے کی تھی مجال
غصّے کی وہ نظر کہ خدا کا عتاب تھا
انساں تو کیا، ہزبر کا زہرہ بھی آب تھا

کیا دخل، چار ہو جو کسی بے ادب کی آنکھ
رکھتی تھی رعب یہ، نہ عجم نہ عرب کی آنکھ
لاکھوں تھے اُس طرف، پہ جھپکتی تھی سب کی آنکھ
غصّہ ستم کا، قہر کی چتون، غضب کی آنکھ
پانی تھا خوفِ جاں سے جگر ہر دلیر کا
آہو شکار کرتے تھے میداں میں شیر کا

رجز

نیزے کو گاڑ کر جو رجز خواں ہوئے جناب
یاد آ گئی ہر اک کو صدائے ابوتراب
فق تھا کسی کا رنگ، تو زہرہ کسی کا آب
ہٹنے لگیں صفیں، یہ ہوا دل کو اضطراب
گھبرا کے دور فوج کے نامی جواں گئے
جو مورچے یہاں تھے، سرک کر وہاں گئے

بعدِ ستائشِ اب و جد شیرِ نر بڑھا
ہٹتی ہوئی گھٹا کی طرف جوں قمر بڑھا
لاکھوں تھے، پہ نہ ایک اُدھر سے اِدھر بڑھا
جرّار تیغ تولے ہوئے بے سپر بڑھا
یوں خندہ رو گیا وہ جری رزم گاہ میں
جاتا ہے جس طرح کوئی اپنی سپاہ میں

ناگاہ فوجِ کیں سے عمر نے کیا کلام
"یہ وقت کارزار ہے، اے ساکنانِ شام!
بس ہے یہی بہادرِ شہنشاہِ خاص و عام
مارا گیا یہ شیر تو مر جائیں گے امام
لوٹو جنابِ فاطمہ زہرا کے باغ کو
ٹھنڈا کرو حسین کے گھر کے چراغ کو

"یہ گل عذار دختر حیدر کی جان ہے
بہنوں کی زندگی ہے برادر کی جان ہے
بابا کی روح ہے تنِ مادر کی جان ہے
بے جاں کرو اسے کہ یہ سب گھر کی جان ہے
جوشن یہی ہے بازوے برنا و پیر کا
بعد اس کے خاتمہ ہے صغیر و کبیر کا"

لڑنے کو اس طرف سے عدو سب کے سب بڑھے
تنہا ادھر سے اکبرِ عالی نسب بڑھے جنگ
چورے قدم نہیب سے جھک کر یہ جب بڑھے
گویا پئے جہاد امیرِ عرب بڑھے
دہشت سے فوجِ شام کی بدنی سمٹ گئی
قدرت خدا کی دن جو بڑھا رات گھٹ گئی

جرار کی زرہ پہ لگے جب کئی خدنگ
صفدر نے پڑھ کے فاتحہ لی تیغ شعلہ رنگ
چمکا اک آئنہ کہ ہوئی فوجِ شام دنگ
دکھلائے تیغ تیز نے بجلی کے رنگ ڈھنگ
تھی کس کو تاب صاعقۂ شعلہ بار کی
یاد آ گئی ہر اک کو چمک ذوالفقار کی

تھم تھم کے یوں گیا صفِ اعدا پہ وہ دلیر
جاتا ہے داؤں کر کے غزالوں پہ جیسے شیر
غافل جو بھوک پیاس میں تھا زندگی سے سیر
کشتوں کے پشتے ہو گئے دم میں، لگے ڈھیر
اک سیل زور و شور سے آئی گزر گئی
ثابت نہ یہ ہوا صفِ اول کدھر گئی

جوہر شناس تیغ زباں! دھیان ادھر کریں
تیزی کو حرف حرف کی مدِ نظر کریں
دشمن ہزار سینے کو اپنے سپر کریں
مصرعے وہ جاں گزا ہیں کہ ٹکڑے جگر کریں
بیتوں میں ذوالفقار کی سب آب و تاب ہے
بین السطور تیغِ حسینی کی تاب ہے

در پے تھی سرکشوں کے جو وہ تیغ جاں ستاں — گوشوں سے تھی بلند صدائے اماں اماں
ترکش سے تیر بھاگ گئے تھے، تیر سے کماں — گردن سے سر، رگوں سے لہو اور بدن سے جاں
یارا عقاب تیر کو پرواز کا نہ تھا
رن میں کہیں نشاں قدر انداز کا نہ تھا

سر لوٹتے تھے برچھیوں والوں کے ہر طرف — ٹکڑے پڑے تھے دشت میں بھالوں کے ہر طرف
پامال تھے سوار رسالوں کے ہر طرف — پرکالے اڑتے پھرتے تھے ڈھالوں کے ہر طرف
خاطر نشاں نہ تھی کسی آفت نشان کی
انبار تھیں کٹی ہوئی شاخیں کمان کی

جب آئی سن سے، کاٹ کے جوشن نکل گئی — اڑ کر صفوں کے بیچ سے ناگن نکل گئی
یوں چاک کر کے سینۂ دشمن نکل گئی — شہ رگ سے جان، صدر سے گردن نکل گئی
سالم رگیں نہ جسم کی، نہ استخواں رہے
ٹوٹے قفس میں طائر وحشی کہاں رہے

وہ گھاٹ باڑھ اور وہ اس کی چمک دمک — کانپی کبھی زمیں، کبھی تھرا گئے فلک
شعلے میں یہ چمک تھی، نہ بجلی میں یہ لپک — ہر ضرب میں سما سے تلاطم تھا تا سمک
کونین میں حواس بجا تھے نہ ایک کے
گاؤ زمیں سمٹتی تھی گھٹنوں کو ٹیک کے

چم خم وہ تیغ کا، وہ لگاوٹ، وہ آب و تاب — آتش کسی جگہ، کہیں بجلی، کہیں سحاب
سیلی تھی اک پری کے شکم پر کہ اس کی تاب — تیزی زباں میں وہ، کہ فرشتوں کو دے جواب
جوہر سے اس کا جسم جواہر نگار تھا
گویا گلے میں حور کے ہیرے کا ہار تھا

چھپ کر یہ ایک کے نہ بحالی نظر پڑی   جو صف بھری ہوئی تھی نہ خالی نظر پڑی
سر پر بھوں کے تیغ ہلالی نظر پڑی   سوے جنوب فوج شمالی نظر پڑی
غل تھا کہ تیغ تیز نہیں، موت آتی ہے
کیوں کر قدم تھمیں، کہ زمیں سرکی جاتی ہے

ملتا نہ تھا صفوں میں علم کا نشاں کہیں   چلّے کہیں تھے شست کہیں تھی کماں کہیں
نیزے کہیں تھے، ڈانڈ کہیں تھی، سناں کہیں   جمدھر کہیں، کمند کہیں، برچھیاں کہیں
اک اک سیاہ رو کا جگر داغ داغ تھا
جنگل تمام ڈھالوں کے پھولوں سے باغ تھا

سرخود سروں کے چنبر گردن سے اڑ گئے   ہاتھ آستیں سے اڑ گئے، سر تن سے اڑ گئے
ڈر ڈر کے سب پرند نشیمن سے اڑ گئے   پائی جو راہ طائر جاں تن سے اڑ گئے
تھے قتل عام پر علی اکبر تُلے ہوئے
رستے تھے بند، زخموں کے کوچے کھلے ہوئے

یارا قرار کا تھا، نہ صورت فرار کی   پیدل کی موت تھی، تو خرابی سوار کی
روئیں تنوں کو تاب نہ تھی ایک وار کی   ٹکڑے تھے دو کے ہاتھ، یہ کھائی تھی چار کی
آگے بڑھے، تو منھ دہیں کٹ جائے گیو کا
بجلی کی تھی کڑک، کہ طمانچہ تھا دیو کا

کرتے تھے فتح جنگ کو جو ایک آن میں   رعشہ تھا اُن کے ہاتھ میں، لکنت زبان میں
دُبکاتے تھے کمند، کمینے کمان میں   ترکش میں تیغیں رکھتے تھے، تیروں کو میان میں
تلوار رکھ کے ہاتھ سے منھ ڈھانپ لیتے تھے
آتی تھی تیغ جب، تو سپر پھینک دیتے تھے

بڑھتے تھے جو پرے سے بڑے بول بول کے — پہلے اُنھیں کو مار لیا رول رول کے
حملہ کیا جو تیغِ دو دم تول تول کے — ہتھیار سب نے پھینک دیے کھول کھول کے
اس شان سے کبھی نہ عجم نہ عرب لڑے
دو دن کی پیاس میں علی اکبر غضب لڑے

گھوڑے کی تعریف

وہ حرب، وہ شکوہ، وہ شانِ پیمبری — نعرے کہ وہ زور و شور کے، وہ ضرب حیدری
وہ تیغ خوں چکاں، وہ جلالِ غضنفری — راکب جو رشکِ حور، تو رہوار بھی پری
چالاک آہوانِ ختن اس قدر نہ تھے
اُڑ جاتا تھا ہما کی طرح، اور پر نہ تھے

وہ جست و خیز و سرعت و چالاکیِ سمند — سانچے میں تھے ڈھلے ہوئے سب اُس کے جوڑ بند
سُم قرصِ ماہتاب سے روشن ہزار چند — نازک مزاج و شوخ و سیہ چشم و سربلند
گر ہل گئی ہوا سے زرا باگ، اُڑ گیا
پتلی سوار کی نہ پھری تھی کہ مُڑ گیا

آہو کی جست، شیر کی آمد، پری کی چال — کبکِ دری خجل، دلِ طاؤس پائمال
سبزہ سبک روی میں قدم کے تلے نہال — اک دو قدم میں بھول گئے چوکڑی غزال
جو آ گیا قدم کے تلے گرد برد تھا
چھل بل غضب کی تھی کہ چھلاوا بھی گرد تھا

افزوں ہے زلفِ حور سے خوشبو ایال کی — دیکھیں، تو لیں بلائیں سدا بال بال کی
پریاں خرامِ ناز میں شاگرد چال کی — غصے میں جست شیر کی، شوخی غزال کی
وہ حُسن تن پہ ساز کا، جوبن یراق کا
دلدل کے ہاتھ پاؤں، تو چہرہ براق کا

نازک مزاج و نسترن اندام و تیز رَو — گردوں سپہر و بادیہ پیما و برق دَو
اُس کا نہ اِک قدم، نہ زغندیں ہرن کی سَو — دو روز سے نہ کاہ ملی تھی اُسے، نہ جَو
رفتار میں ہَوا تھا، اشارے میں برق تھا
سُرعت میں کچھ کمی تھی، نہ چھل بل میں فرق تھا

صرصر سے تند، بُو سے سُبک رَو، ہوا سے تیز — چالاک فہم و فکر سے، ذہنِ رسا سے تیز
طاؤس و کبک و نسر و عقاب و ہما سے تیز — جانے میں اُڑ کے ہُدہُدِ شہرِ سبا سے تیز
ذی جاہ تھا، سعید تھا، فیروز بخت تھا
رہوار کیا، ہَوا پہ سلیماں کا تخت تھا

سمٹا، جما، اڑا، اِدھر آیا، اُدھر گیا — چمکا، پھرا، جمال دکھایا، ٹھہر گیا
تیروں سے اُڑ کے برچھیوں میں بے خطر گیا — برہم کیا صفوں کو، پروں سے گزر گیا
گھوڑوں کا تن بھی ٹاپ سے اُس کی نگار تھا
ضربت تھی نعل کی، کہ سروہی کا وار تھا

پھر تو جمی صفوں کی صفائی تھی ہر طرف — وہ شیر ہر جگہ تھا، لڑائی تھی ہر طرف
تلوار سے سروں کی جدائی تھی ہر طرف — مثلِ صبا فرس کی رسائی تھی ہر طرف
سرکس جگہ نہ گرتے تھے، کاوا کہاں نہ تھا
بجلی کہاں نہ تھی، وہ چھلاوا کہاں نہ تھا

پڑتا تھا پھیلا جو چمک کر اِدھر اُدھر — چل جاتے تھے کلیجوں پہ خنجر اِدھر اُدھر
کٹ کر تنوں سے گرتے تھے سر اِدھر اُدھر — زخمی تڑپ رہے تھے برابر اِدھر اُدھر
رُکتا نہ تھا سمند کہیں اونچ نیچ میں
ندی لہو کی بہتی تھی لشکر کے بیچ میں

آفت کا معرکہ تھا، قیامت کی جنگ تھی　　کوسوں لہو سے رن کی زمیں لالہ رنگ تھی
اللہ ری برق و شرق! کہ بجلی بھی دنگ تھی　　چمکی کسی سوار پہ جب، زیرِ تنگ تھی
جو کھینچتے ہیں سر، وہی پامال رہتے ہیں
نام آوروں کی تیغوں کے منہ لال رہتے ہیں

بھاگے تھے خود اپنی بلا سر پہ ٹال کے　　بھاگے چھپے تھے امن کی جا دیکھ بھال کے
تلواریں منہ چھپاتی تھیں دامن میں ڈھال کے　　زرہیں تھیں یا کھلے ہوئے حلقے تھے جال کے
چار آئینے پڑے تھے زمیں پر کٹے ہوئے
لٹکے تھے جوشنوں کے گریباں پھٹے ہوئے

جس صف پہ آئی، کاٹ گئی خودسروں کے ہاتھ　　تھرا رہے تھے خوف سے نام آوروں کے ہاتھ
فرماتے تھے اڑا کے برابر پروں کے ہاتھ　　"چلتے ہیں کارزار میں یوں صفدروں کے ہاتھ
پیراک مانتے نہیں دریا کے شور کو
دیکھا مرے تھکے ہوئے ہاتھوں کے زور کو

"میں جاں بلب وہی ہوں جو مرتا تھا پیاس سے　　دیکھو لڑا ہوں لاکھوں میں کس کس حواس سے
کیوں دور بھاگے جاتے ہو شیروں کے پاس سے؟　　ماروں کسے، کہ مرتے ہو تم خود ہراس سے
کیوں ہونٹھ خشک ہو گئے، کیا تشنہ کام ہو؟
تلوار سے مرو، کہ جوانوں میں نام ہو"

کچھ تیغ سے بھی تیز تھے سیفِ زباں کے وار　　کٹ کٹ کے سر جھکاتے تھے لشکر کے نامدار
گھوڑے بڑھا بڑھا کے ہٹاتے تھے بار بار　　کیا تاب تھی، کرے جو کوئی مرکے آنکھ چار
زہرے تھے آب، غیظ جو تھا اس جناب کو
گھورا ہے شپرک نے کبھی آفتاب کو؟

چھائی ہوئی تھی ڈھالوں کی ہر سو گھٹا سیاہ
بجلی چمک رہی تھی، کہ اللہ کی پناہ!
چھپنے کی نہ جگہ، نہ کہیں بھاگنے کی راہ
ندی چڑھی تھی، فوج کا بیڑا تھا سب تباہ
جو گھاٹ پر تھا، خون میں وہ شور بور تھا
سارا یہ تیغ تیز کے زبانی کا شور تھا

چلّا رہا تھا یوں پسر سعد کینہ جو
"کس سے کہوں، بہائے جو اس شیر کا لہو؟
جاتا ہی تین روز کا پیاسا کینا یہ جو
جانوں کے ساتھ آج گئی سب کی آبرو
گھیرو کرن میں نیزوں کی اس آفتاب کو
کیوں خاک میں ملاتے ہو موتی کی آب کو

"نام آوروں کو چاہیے عزت کا اب خیال
کر دو دریائے فاطمہ زہرا کو پائمال
حاضر ہیں خلعت و زر و جاگیر و اسپ و مال
خون اس کا جو بہائے، وہ بھر لے طلا سے تھال
باقی مجاہدوں میں یہی نور عین ہی
خنجر ہی پھر تو، اور گلوے حسین ہی

"تلواریں لو نیاموں سے، جلدی پرے جماؤ
نیزے ہلا ہلا کے سوارو ادھر کو آؤ
ہاں اے کماں کشو! قدر انداز یاں دکھاؤ
فرزند فاطمہ کے لہو کا لہو بہاؤ
گر نور احمدی کی جہاں میں ضیا نہ ہو
انعام پھر وہ دوں، جو کسی نے دیا نہ ہو"

نکلا یہ سن کے غیظ میں اک پہلوان روم
گیتی کے چار دانگ میں تھی جس شقی کی دھوم — رومی پہلوان
سرہنگ و پُر غرور و سیہ قلب و نحس و شوم
لنگر سے جس کے ہل گئی مقتل کی مرز و بوم — سے مقابلہ
مرحب تھا کفر و شرک میں، طاقت میں گیو تھا
گھوڑے پہ تھا شقی، کہ پہاڑ پہ دیو تھا

چہرہ مہیب، غیظ سے آنکھیں لہو کے جام
تھرّائے سام خوف سے، کاندھے پہ وہ حسام
موذی، سیاہ بخت، سیہ دل، سیاہ فام
کھاتا تھا لاکھ بل جو کوئی لے علی کا نام
کندہ سقر کے کفر کا، پُتلا گناہ کا
دشمن تھا خاندانِ رسالت پناہ کا

ٹکڑے کرے پہاڑ کو وہ گرز گاؤ سر
پہنے ہوئے زرہ پہ زرہ بر میں بد گہر
زنجیرِ آہنی سے کسے جنگ پر کمر
مُنھ پھیرے جس سے تیغ وہ فولاد کی سپر
دستانے دونوں دستِ تعدّی پسند پر
پاکھر بھی آہنی تھی شقی کے سمند پر

اکبر تو مُسکرائے ستمگر کو دیکھ کر
فرمایا "آدمی ہے کہ صحرا کا جانور!"
ہمّت پکاری اے اسدِ حق کے شیرِ نر
یہ نابکار آئے تو جاتا ہے اب کدھر
جوشن سمیت کیجیے دو اک حسام میں
لائی ہے موت دیو کو لوہے کے دام میں

ہاں اے محیطِ طبع! روانی دکھا مجھے
پیری میں زور و شورِ جوانی دکھا مجھے
ہاں اے زبان! سیف زبانی دکھا مجھے
اے نطق! آج سحر بیانی دکھا مجھے
تلواریں کھنچ گئیں دمِ تیغ آزمائی ہے
آفت کا معرکہ ہے، غضب کی لڑائی ہے

اے تیغِ بادشاہِ نجف! شعلہ بار ہو
اے شہسوار! مستعدِ کارزار ہو
اے برقِ طبع! کوند کے گردوں کے پار ہو
اے سیفِ خامۂ دو زباں! ذوالفقار ہو
ہاں معرکہ ہے، بن کے لڑائی بگڑ نہ جائے
چومیں نئی ہوں سب کوئی مضمون لڑ نہ جائے

ہاں غازیو! دکھاتا ہوں تصویرِ حرب گاہ
غل ہو رہا تھا اب عوضِ شورِ واہ واہ
تولے ہوئے تیغ اِدھر تھے پسرِ شاہِ دیں پناہ
آمادۂ نبرد اُدھر ہو وہ روسیاہ
دونوں کو معرکے میں تمنا ہو جنگ کی
باگیں اُٹھی ہوئی ہیں کمیت و سُرنگ کی

بڑھتا ہوا رجز جو بڑھا وہ ستم شعار
چلنے لگے اِدھر سے بھی تیغِ زباں کے وار
بھولا کلامِ زور و تعلی وہ نابکار
لب کیا ہلے کہ چل گئی حیدر کی ذوالفقار
گویا ہوں یہ، تو کس کو مجالِ سخن ملے
منھ بھر گیا، جواب وہ دنداں شکن ملے

فرمایا ہم سے مکر کی باتیں، خدا کی شان!
نیزے سے چھید لیتے ہیں کذاب کی زبان
روباہ اور شیر کے بچوں کا امتحان؟
کیا تاب، کیا مجال ہو، اور کیا کسی میں جان
بے تیغ اگر بڑھوں، تو ابھی تو ہلاک ہو
ٹکڑوں کمر پکڑ کے، تو پیوندِ خاک ہو

"لادا ہو تو نے جسم پہ کیوں بوجھ اس قدر؟
آہن ہو اپنی تیغ کے آگے خیار تر
ظالم! تجھے خرابیِ خیبر کی ہو خبر؟
مرحب کو کس نے بھیج دیا جانبِ سقر؟
کیا جانے جس کو شیروں سے پالا پڑا نہ ہو
لوہا ہو نرم موم سے، جب دل کڑا نہ ہو"

ان جو دنوں سے ہو گیا ظالم کا ذہن کند
بھاری سبق تھا بھول گیا سب نوشت و خواند
بڑھ کر جو دل بڑھانے لگے افسرانِ جند
آیا اُڑا کے رخش کو وہ مثلِ بادِ تند
برچھا اُدھر شقی نے لیا دیکھ بھال کے
اکبر اِدھر سنبھل گئے بھالا سنبھال کے

نیزے سلے، وہ چل گئیں چوٹیں کہ الاماں! — ہر طعن قہر کی تھی، قیامت کی ہر تکاں
چنگاریاں اُڑیں، جو سناں سے لڑی سناں — دو اژدہے گتھے تھے نکالے ہوئے زباں
پھیلے شرر، پرندوں کی جانیں ہوا ہوئیں
شمعوں کی تھیں لویں، کہ ملیں اور جدا ہوئیں

اِن کی طرف خدا تھا، اُدھر لشکرِ غنیم — سردارِ شام سب تھے میانِ اُمید و بیم
وہ کفر میں قوی، یہ رہِ حق میں مستقیم — دونوں طرف سے تھی کشش و کوششِ عظیم
ہانپے تھے دم ملے ہوئے گھوڑوں کی گشت سے
خاک آسماں پہ جاتی تھی اُڑ اُڑ کے دشت سے

اِن کا نہ ایک وار، نہ اُس کے ہزار بند — بڑھ بڑھ کے کھول دیتا تھا یہ شہسوار بند
کیّاد نیزہ بازی میں تھا بار بار بند — چوٹوں سے نیلگوں تھے جفا جو کے چار بند
خالی گئی نہ فرق کی، نہ دست و پا کی چوٹ
کھُلتی بھی ہے بندھی ہوئی مشکل کشا کی چوٹ؟

ڈوبی گرہ میں نیزۂ ظالم کی جب سناں — گھوڑا اُڑا کے ہاتھ کو اکبر نے دی تکاں
اللہ رے زور! اُٹھ گیا گھوڑے سے پہلواں — دستِ شقی سے چھوٹ گئی ڈانڈ ناگہاں
نیزے کے ساتھ شور اُٹھا اُس گروہ سے
لو اژدہے کو لے گیا سیمرغ کوہ سے

ظالم نے ڈھال دوش سے لی اور کمر سے تیغ — بدلا تھا اُس نے ٹھاٹھ، کہ چمکی اِدھر سے تیغ
دو چار بار ڈوب کے نکلی سپر سے تیغ — چلنے میں گھٹتی بڑھتی تھی کس کس ہنر سے تیغ
مضطر تھا، اپنی ذلت سے دشمن کہ یاس تھی
جب ہاتھ اُٹھ گیا، یہ کلائی کے پاس تھی

چمکی سپر کے پاس کبھی برق کی مثال
شانے پہ آئی، سینے پہ لی جب شقی نے ڈھال
سر کو بچا کے کاٹ گئی وہ زرہ کا جال
جو میں کڑی پڑی تھیں، کہ مضطر تھا بد خصال
روکے کسے، جواب کسے دے، کدھر پھرے
بجلی کے ساتھ ساتھ کہاں تک سپر پھرے

کرتا تھا ہاتھ اپنی صفائی کو آشکار
تیغ اپنے جوہروں کو دکھاتی تھی بار بار
جنگ آزمودہ، آتش سوزندہ، آب دار
آفت کا مُنہ، غضب کی روانی، ستم کی دھار
جس دن سے اُتری سان سے، رن پر چڑھی رہی
اکبر سے بھی دغا میں کچھ آگے بڑھی رہی

چمکی جو تیغ، ڈھال وہ لایا قریب سر
اِک برق سی گری، کہ دو پارہ ہوئی سپر
مغفر سے سر میں تھی، سر و گردن سے صدر پر
سینے سے جب بڑھی یہ، ہوا تب وہ باخبر
سب نشۂ غرورِ جوانی اُتر گیا
تلوار تھی، کہ حلق سے پانی اُتر گیا

قربان تیغ تختِ دلِ بادشاہِ دیں
گزری کمر سے، کاٹ کے زنجیر آہنیں
باقی درست تھی، نہ سلامت تھا صدر زیں
دو ایک ضرب میں تھا مع اسلحہ لعیں
کاٹا سمند بانوں کو ریتی میں گاڑ کے
پھٹ کر گرے زمین پہ ٹکڑے پہاڑ کے

تکبیر کی صدا سے ہلے دشت و کوہسار
یاد آیا جبرئیل کو دستِ خدا کا وار
چلائے شاہِ دیں کہ "میں اِس ضرب کے نثار
فاقے میں تین دن کے یہ حملے، یہ کارزار
بجلی گری ہے، تیغ شقی پر چلی نہیں
افسوس ہر کرن یہاں بے بی نہیں"

تسلیم کر کے شہ کو پکارا وہ نوجواں — "اب پیاس مارے ڈالتی ہے، یا شہ زماں!
تالو ہے خشک، اینٹھ گئی ہے مری زباں — جلتا ہے دل، کلیجے سے اٹھتا ہے جیسے دھواں
دریا پہ قتل ہوتا ہوں میں قحط آب سے
ہتھیار گرم ہیں تپش آفتاب سے"

یہ کہہ کے ابر شام میں ڈوبا وہ رشک ماہ — پایا جو بیچ میں، تو سمٹ آئی سب سپاہ
ڈھالوں سے دشت کیں تھا کئی کوس تک سیاہ — تلوار چل رہی تھی کہ اللہ کی پناہ!
لاکھوں سے معرکے میں کوئی یوں لڑا نہیں
غل تھا، عرب میں رن کبھی ایسا پڑا نہیں

شہادت

لڑتے تھے پر نہ ہوتا تھا انبوہ فوج کم — نیزوں کی صف ادھر، تو ادھر برچھیاں بہم
بہر وغا کمیں میں گئے بانیِ ستم — جنگل تھا فوج کا، کمک آتی تھی دم بہ دم
مارا جو پیدلوں کو، سوار آ کے جم گئے
سو قتل ہو گئے، تو ہزار آ کے جم گئے

جب اس جری نے قتل کیے سیکڑوں جواں — ہر صف سے، ہر پرے سے اٹھا شور الاماں
چلایا ابن سعد سیہ قلب و سخت جاں — "نکلیں، وہ دس ہزار کماں دار ہیں کہاں
برچھی کا اب ہے کام، نہ تلوار چاہیے
اس نوجواں پہ تیروں کی بوچھار چاہیے"

یہ سن کے تشنہ لب پہ چلے چار سو سے تیر — پتھر عقب سے پڑنے لگے، روبرو سے تیر
آئے تھے فوج فوج سپاہ عدو سے تیر — سب سرخ تھے شبیہ نبی کے لہو سے تیر
تیروں کا کیا ہجوم تھا اس نور عین پر
پروانے گر رہے تھے چراغ حسین پر

نکلے کماں کشوں کے جو حلقے سے وہ جناب — تھی پھر تو برچھیوں کی کرن گرد آفتاب
ڈوبے لہو میں کٹنے لگا گلشنِ شباب — روتے تھے خوں کے آنسوؤں سے دیدۂ رکاب
مجروح شیر بیچ میں تھا اُس ہجوم کے
نیزوں پہ نیزے کھا رہے تھے جھوم جھوم کے

طے کر کے معرکہ پھرے تھے، کہ ناگہاں — چھاتی پہ سامنے سے لگی ظلم کی سناں
دل توڑ کر انی جو ہوئی پشت سے عیاں — نیزہ جگر سے کھینچ کے تڑپا وہ نوجواں
ٹکڑے جگر کے خوں کے دڑیڑوں سے بہہ گئے
گھوڑے پہ یا علی ولی کہہ کے رہ گئے

چلّا رہا تھا یوں پسرِ سعدِ روسیاہ — "ابنِ نمیر! کیا ترا نیزہ چلا ہے، واہ!
ہم میں کسی سے قتل نہ ہوتا یہ رشکِ ماہ — بے کس حسین ہو گئے، دنیا ہوئی تباہ
کر دے کوئی خبر، علی اکبر گزر گئے
دیکھو تڑپ رہے ہیں، کہ شبیر مر گئے"

پہنچی یہ جاں گزا جو صدا گوشِ شاہ میں — دُنیا سیاہ ہو گئی شہ کی نگاہ میں
دوڑے، گرے، اُٹھے، کٹی جا اتنی راہ میں — آئے جگر کو تھامے ہوئے قتل گاہ میں
چاروں طرف جلال میں جاتے تھے اس طرح
بچّے کو کھو کے شیر تڑپتا ہے جس طرح

دوڑے گئے اِدھر کبھی، جھپٹے اُدھر کبھی — بن میں کبھی تھے، رن میں کبھی، نہر پر کبھی
تھامی کمر کبھی، تو سنبھالا جگر کبھی — کی مڑ کے خیمہ گاہ کی جانب نظر کبھی
تشویش تھی، کہ مادرِ اکبر نکل نہ آئے
خیمے سے بنتِ فاطمہ باہر نکل نہ آئے

چلاتے تھے کہ "اے علی اکبر! کدھر ہے تو؟ مرتا ہے باپ، اے مرے دلبر! کدھر ہے تو؟
کچھ سوجھتا نہیں، مرے یاور! کدھر ہے تو؟ دن ہے کہ رات، اے مہِ انور! کدھر ہے تو؟
آباد گھر حسین کا تاراج ہو گیا
خورشید دوپہر سے غروب آج ہو گیا

"بیٹا! ضعیف باپ کدھر ڈھونڈھنے کو جائے؟ بچھڑے پدر سے عین جوانی میں ہائے ہائے!
دشمن کو بھی خدا نہ فراقِ پسر دکھائے پھر، بابا جان کہہ کے پکارو، تو چین آئے
کیونکر قرار آئے دلِ ناصبور کو؟
لاؤں کہاں سے ڈھونڈھ کے آنکھوں کے نور کو؟"

ناگہ صدا یہ آئی کہ "بابا! ادھر ہوں میں جلد آیئے کہ آپ کا پیارا پسر ہوں میں
خالق سے لو لگی ہے، چراغِ سحر ہوں میں اب کوچ ہے قریب، سرِ رہ گزر ہوں میں
دردِ جگر کہیں نہ اجل کا بہانہ ہو
دیدار دیکھ لے، تو مسافر روانہ ہو"

دوڑے حسین سن کے یہ آوازِ دردناک دامن تھا سب، قمیصِ تنِ یوسفی کا چاک
فرزند لوٹتا نظر آیا بروئے خاک بس گر پڑے پسر کے برابر امامِ پاک
تڑپا جو دل، تو تختِ جگر سے لپٹ گئے
روحی فداک کہہ کے پسر سے لپٹ گئے

دیکھی عجیب حالتِ فرزندِ نوجواں ہچکی گلے میں، ہونٹوں پہ نکلی ہوئی زباں
تن پر جراحتِ تبر و خنجر و سناں گردن تھی کج، پھری ہوئی آنکھوں کی پتلیاں
ٹاپوں سے مرکبوں کی جراحت پھٹے ہوئے
چہرہ سفید، خاک میں گیسو اٹے ہوئے

برچھی سے ٹکڑے ٹکڑے تھا لختِ جگر کا دل
خود باپ نے چھدا ہوا دیکھا پسر کا دل
ہوتا ہو آبگینے سے نازک بشر کا دل
پتھر کا دل نہیں ہے، یہ دل ہے پدر کا دل

ایوب بھی اگر ہوں، تو دم بھر نہ کل پڑے
آنسو تھمیں، تو منہ سے کلیجا نکل پڑے

پیری میں آفتِ غمِ اولاد، الاماں!
دل اور زخمِ خنجرِ بیداد، الاماں!
وہ اضطرابِ خاطرِ ناشاد، الاماں!
وہ اشکِ شور اور وہ فریاد، الاماں!

بیٹا نہ ہو، تو زیست کا پھر کیا مزا رہا
جب گھر اجڑ گیا تو زمانے میں کیا رہا

بسمل کے لوٹنے کی کسی دل کو کیا خبر
غربت میں کون لٹ گیا، منزل کو کیا خبر
کشتی کے ڈوب جانے کی ساحل کو کیا خبر
کس پر چھری یہ چل گئی، قاتل کو کیا خبر

خاروں سے پوچھیے، نہ کسی گل سے پوچھیے
صدمہ چمن کے لٹنے کا بلبل سے پوچھیے

بچھڑا وہ لال جس کا گوارا نہ تھا فراق
فرماتے تھے کہ "لوٹ لیا تو نے اے عراق!
اے موت! جلد آ، کہ بس اب زندگی ہے شاق
خنجر کی آرزو ہے، شہادت کا اشتیاق

برباد اس طرح کوئی آباد گھر نہ ہو
کیا زندگی کا لطف جب ایسا پسر نہ ہو؟

"سب جا ہیں جس کی زیست وہ شیر ژیاں مرے
افسوس! ہم جاں جیے، جانِ جہاں مرے
پیدا تو کس جگہ ہوئے، آکر کہاں مرے
قدرت خدا کی پیر جیے، نوجواں مرے

اس عمر میں جہاں سے گزرنے کے دن نہ تھے
کہتا ہے خود شباب کہ مرنے کے دن نہ تھے

"سمجھے تھے ہم، نبھے گا نہ پیر و جواں کا ساتھ
پیر و جواں کا ساتھ ہو، تیر و کماں کا ساتھ
غربت میں کون دے پدرِ ناتواں کا ساتھ
وا حسرتا! کہ چھوٹ گیا کارواں کا ساتھ
یوں قافلے سے چھوٹ کے شبیر رہ گیا
سب نوجواں چلے گئے، یہ پیر رہ گیا"

لکھتا ہے ایک راوی غمگین و پُر ملال
یعنی اِدھر ہوا علی اکبر کا انتقال
نکلی حرم سے ایک زنِ فاطمہ جمال
گویا جنابِ سیّدہ کھولے ہوئے تھیں بال
تھی اس طرح سے رُخ پہ ضیا اس جناب کے
حلقہ ہو جیسے نور کا گردِ آفتاب کے

چلاتی تھی "ارے مرا پیارا ہے کس طرف؟
اے آسماں! وہ عرش کا تارا ہے کس طرف؟
اے ابرِ شام! چاند ہمارا ہے کس طرف؟
اے ارضِ کربلا! وہ سدھارا ہے کس طرف؟
ہے ہے سناں سے جان گئی میہمان کی
میت کدھر کو ہے مرے کڑیل جوان کی؟

وا اے میرے لمبے گیسوؤں والے! کدھر ہے تو؟
ہے ہے! مری غریبی کے پالے، کدھر ہے تو؟
واری کہاں لگے تجھے بھالے، کدھر ہے تو؟
کیوں کر کہیں جگر کو سنبھالے، کدھر ہے تو؟
اٹھارواں برس تھا، کہ موت آگئی تجھے
اے نورِ عین! کسی کی نظر کھا گئی تجھے؟

اے میرے گل بدن، مرے ابرو کماں جواں
اے میرے کم سخن! مرے شیریں بیاں جواں
اے میرے صف شکن! مرے حیدر نشاں جواں
اے میرے تیغ زن! مرے شیر ژیاں جواں
لاکھوں سے معرکہ تھا، آفت اب میں
دو دن کی پیاس نے تجھے مارا شباب میں

"ہی ہی مرے سعید و رشید و متیں جواں
خوش رو جواں، غریب جواں، مہ جبیں جواں
صفدر جواں، شکیل جواں، نازنیں جواں
کس نے تجھے مروڑ لیا، اے حسیں جواں!
آغاز تھیں میں، ابھی ایسے سن نہ تھے
بچے مرے! ابھی ترے مرنے کے دن نہ تھے"

یا رب! کسی کا باغ تمنا خزاں نہ ہو
دنیا میں بے چراغ کوئی خانماں نہ ہو
ماں باپ سے جدا پسر نوجواں نہ ہو
چھٹ جائیں سب، پہ فرقت آرام جاں نہ ہو
گر لاعلاج ہے، تو کلیجے کا داغ ہے
بدتر وہ قبر سے ہے، جو گھر بے چراغ ہے

دشمن کو بھی جہاں میں فراق پسر نہ ہو
ویراں کسی غریب کا آباد گھر نہ ہو
ہوں سب طرح کے درد، پہ درد جگر نہ ہو
یا رب! کسی کو صدمۂ نور نظر نہ ہو
مٹی ہے، سلطنت جو ملے کائنات کی
بیٹا نہ ہو، تو خاک ہے لذت حیات کی

امامِ حسینؑ کا جہاد

عالمِ تنہائی

جب خاتمہ بہ خیر ہوا فوج شاہ کا
کوثر پہ قافلہ گیا پیاسی سپاہ کا
گھر لُٹ گیا جنابِ رسالت پناہ کا
خاک اڑ رہی تھی، حال یہ تھا بارگاہ کا

وہ بھائی، وہ رفیق، نہ وہ نورِ عین تھے
نرغے میں دشمنوں کے اکیلے حسین تھے

ڈیوڑھی وہ، صبح تک تھے دو دوسَہ جہاں سوار
خادم وہاں تھا کوئی، نہ کوئی رفیق دیار
وہ لُو، وہ دوپہر کی تپش، اور وہ غبار
پردہ ہوا سے سر کو پٹکتا تھا بار بار

آفت تھی، بیکسی تھی، مصیبت تھی، یاس تھی
بے فوج بادشاہ تھا، ڈیوڑھی اُداس تھی

تلواریں برسیں صبح سے نصف النہار تک
ہلتی رہی زمین، لرزتے رہے فلک
کانپا کیے پَروں کو سمیٹے ہوئے ملک
نعرے نہ پھر وہ تھے، نہ وہ تیغوں کی تھی چمک

ڈھالوں کا دَور، برچھیوں کا اوج ہو گیا
ہنگام ظہر خاتمۂ فوج ہو گیا

لاشے سبھوں کے سبطِ نبی خود اُٹھا کے لائے
قاتل کسی شہید کا سر کاٹنے نہ پائے
دشمن کو بھی نہ دوست کی فرقت خدا دکھائے
فرماتے تھے، بچھڑ گئے سب ہم سے ہائے ہائے

اتنے پہاڑ گر پڑیں جس پر، وہ خم نہ ہو؟
گر سو برس جیوں، تو یہ مجمع بہم نہ ہو

لاشے تو سب کے گرد تھے، اور بیچ میں امام
ڈوبی ہوئی تھی خوں میں نبی کی قبا تمام
افسردہ و حزین و پریشان و تشنہ کام
برچھی تھی دل کو فتح کے باجوں کی دھوم دھام
اعدا کسی شہید کا جب نام لیتے تھے
تھرا کے دونوں ہاتھوں سے دل تھام لیتے تھے

پوچھو اُسی سے جس کے جگر پر ہوں اتنے داغ
اک عمر کا ریاض تھا جس پر، لٹا وہ باغ
فرصت نہ اب بکا سے، نہ ماتم سے ہے فراغ
جو گھر کی روشنی تھے، وہ گُل ہو گئے چراغ
پڑتی ہے دھوپ سب کے تنِ پاش پاش پر
چادر بھی اک نہیں علی اکبر کی لاش پر

ماتم اِدھر تھا، فوج کے باجوں کی دھوم اُدھر
یاں بے کسی تھی، فوجِ عدو کا ہجوم اُدھر
باہم تھے سرکشانِ لَے دشام و روم اُدھر
زر بانٹتا تھا خود پسرِ سعدِ شوم اُدھر
ہر شخص نعمتوں سے اُدھر کامیاب تھا
گرمی میں تین روز سے یاں قحطِ آب تھا

ہوتی تھی فوجِ ظلم میں تدبیرِ قتلِ شاہ
چھائی ہوئی تھی چار طرف شام کی سپاہ
کہتا تھا یہ جما کے صفیں شمرِ روسیاہ
"آتا ہے جنگ کو پسرِ ضیغمِ الٰہ
حلقے میں لے لو آتے ہی یوں اس دلیر کو
جنگل میں گھیر لیتے ہیں جس طرح شیر کو

"رکھتا نہیں کوئی یہ غریب الدیار یار
شمشیر شعلہ بار پڑے سر پہ بار بار
تیروں کی تن پہ دور سے ہو بے شمار مار
نیزے اُٹھا اُٹھا کے کریں سب سوار وار
آگے سے تیغ و خنجر و تیر و سناں چلیں
پیچھے سے فرقِ پاک پہ گرزِ گراں چلیں

"ہاں غازیو! قریب ہے اب تیسرا پہر — جائیں لڑا کے جلد کرو اس مہم کو سر
بجتا ہے کوئی آن میں نقارۂ ظفر — عابد کے ہاتھ باندھ کے اب کھولیو کمر
راحت دلوں کو ہوئے گی قتلِ حسین سے
سیدانیوں کو لوٹ کے سوئیں گے چین سے"

روتے ہوئے حرم میں چلے قبلۂ انام — رنگیں لہو سے تختِ جگر کے قبا تمام
رخ زرد، دل میں درد، بدن سرد، تشنہ کام — طاقت نہ قلب میں، نہ بدن میں لہو کا نام
یہ درد تھا بکا میں کہ دل ٹکڑے ہوتے تھے
یہ حال تھا کہ رونے پہ دشمن بھی روتے تھے

داخل ہوئے جو خیمے میں حضرت بصد ملال — محبوبِ حق کی آل کا دیکھا عجیب حال
بیٹھے ہیں فرشِ خاک پہ سب کھولے سر کے بال — برپا ہے شورِ ماتمِ فرزندِ خوش جمال
رخسارہ نیل گوں ہیں گریبان چاک ہیں
زینب کا ہے یہ حال کہ غم سے ہلاک ہیں

پُرخوں جبیں، پھٹے ہوئے کپڑے، بدن پہ خاک — چادر سیاہ، ایک گریباں ہزار چاک
دل بھی جگر بھی، سینۂ پُرخوں بھی دردناک — بے کس بہن کے حال پہ روئے امامِ پاک
فرمایا خوں میں اکبرِ مہ رو نہائے ہیں
ہم اُن کی لاش چھوڑ کے رخصت کو آئے ہیں

"سر بارِ دوش ہے، ہمیں رخصت کرو بہن — اب عن قریب خیمۂ عصمت ہیں تیغ زن
مردے پڑے ہوئے ہیں عزیزوں کے بے کفن — پامال ہو نہ لاشۂ فرزندِ صف شکن
محجوب ہم ہیں، قاسمِ بے پر کی روح سے
شرمندگی نہ ہو علی اکبر کی روح سے

"عباس اب کہاں ہیں، کہاں اکبرِ حسیں
اعدا کو بڑھ کے روکنے والا کوئی نہیں
خیمے تک آ نہ جائے کہیں فوجِ اہلِ کیں
رخصت کرو حسین کو اے زینبِ حزیں!
لا دو رسولِ پاک کا رختِ کہن ہمیں
پہنا دو اپنے ہاتھ سے زینب کفن ہمیں"

وہ بولی "میری جان نکل لے، تو جائیے
خنجر اجل کا حلق پہ چل لے، تو جائیے
مضطر ہی دل بہن کا سنبھل لے، تو جائیے
اچھا، ذرا سکینہ بہل لے، تو جائیے
بالوں پہ خاک اڑا کے، منہ اشکوں سے دھو تو لوں
ماں جائے بھائی! ہیں تجھے جی بھر کے رو تو لوں"

فرمایا شہ نے "صبر بہن! چاہیے تمھیں
خالق کی یاد سر و علن چاہیے تمھیں
لب پر رضا کا سخن چاہیے تمھیں
جو ماں کا تھا چلن، وہ چلن چاہیے تمھیں
ہر بار پوچھتے تھے سبب آہ سرد کا
شکوہ کیا علی سے نہ پہلو کے درد کا

"سچ ہی کہ تم کو مجھ سے محبت ہی اے بہن!
کیا کیجے ناگزیر یہ فرقت ہی اے بہن!
پیارے تمھارے بھائی کی رخصت ہی اے بہن!
دنیا مقام رنج و مصیبت ہی اے بہن!
بھولے نہ یاد حق کبھی، گو حال غیر ہو
اس کی ظفر ہو خاتمہ جس کا بہ خیر ہو

"کیا کرتیں تم؟ بہن! اجل آتی وطن میں گر
یکساں ہی مرنے والوں کو جنگل ہو یا کہ گھر
در پیش ہی سفر میں ہمیں خلق سے سفر
اب آرزو یہ ہی کہ کٹے تن سے جلد سر
ہر دکھ میں خوش ہیں وہ، جنھیں الفت خدا کی ہی
میرا نہیں، یہ سر تو امانت خدا کی ہی"

سکینہ سے رخصت

دیکھا یہ کہہ کے بالی سکینہ کو پاس سے — لپٹی وہ دوڑ کر شہ گم دوں اساس سے
طاقت نہ تھی کلام کی ہر چند پیاس سے — بولی وہ تشنہ کام شہ حق شناس سے

"کیا اس بلا کے بن سے تہیہ سفر کا ہے؟
صدقے گئی بتاؤ، ارادہ کدھر کا ہے"

فرمایا شہ نے "ہاں یہ سفر ناگزیر ہے — آؤ، گلے لگو، کہ یہ صحبت اخیر ہے
اب آرزوئے قربِ خدائے قدیر ہے — تنہا ہیں ہم، سپاہِ مخالف کثیر ہے

طے ہو یہ مرحلہ جو عنایت خدا کرے
جس کا نہ کوئی دوست ہو، بی بی! وہ کیا کرے

"جانا ہے دور، شب کو جو آنا نہ ہو ادھر — ضد کر کے رو ئیو نہ، ہمیں چاہتی ہو گر
پہلے پہل ہے آج شبِ فرقتِ پدر — سو رہیو ماں کی چھاتی پہ غربت سے رکھ کے سر

راحت کے دن گزر گئے، یہ فصل اور ہے
اب یوں بسر کرو، جو یتیموں کا طور ہے"

ننھے سے ہاتھ جوڑ کے بولی وہ تشنہ کام — "بتلائیے مجھے کہ یتیمی ہے کس کا نام"
آنکھوں سے خوں بہا کے یہ کہنے لگے امام — "کھل جائے گا یہ درد و الم تم پہ تا بہ شام

بی بی! نہ پوچھو کچھ، یہ مصیبت عظیم ہے
مرجائے جس کا باپ، وہ بچہ یتیم ہے

"بندے اتارو، طوق بڑھاؤ، پدر نثار — چھینا کہیں، جو لوٹنے آئیں ستم شعار
چلائیو نہ اَینَ اَبی کہہ کے بار بار — دشمن ہمارے نام کا ہے شمر نابکار

لو الوداع جاتے ہیں اب قتل گاہ میں
سونپا تمہیں خدا و نبی کی پناہ میں"

یہ کہہ کے پیاری بیٹی سے دیکھا اِدھر اُدھر
پوچھا "کدھر ہیں بانوے ناشاد و نوحہ گر؟"
فضہ نے عرض کی کہ "اُدھر بیٹھی ہیں سر
رخصت کی بھی حضور کی اُن کو نہیں خبر
لب پر گھڑی گھڑی علی اکبر کا نام ہے
چلیے ذرا کہ کام اب اُن کا تمام ہے"
روتے ہوئے گئے جو وہاں شاہِ خوش خصال
دیکھا کہ غش میں خاک پہ بکھرے ہوئے ہیں بال
شبیر بیٹھ کر یہ پکارے بصد ملال
"اے شہر بانو! ہوش میں آؤ، یہ کیا ہے حال؟
سچ ہے، فلک نے تم کو بڑے دُکھ دکھائے ہیں
صاحب! اُٹھو، ہم آخری رخصت کو آئے ہیں"
سُن کر صدا حسین کی چونکی وہ نوحہ گر
کی عرض سر جھکا کے قدم پہ بچشم تر
"تنہا حضور آئے ہیں، باندھے ہوئے کمر
صاحب! کہاں ہے منتوں والا مرا پسر؟
ایسے نہیں جو دُکھ میں جُدا ہوں وہ باپ سے
اپنے مرادوں والے کو لوں گی میں آپ سے
اے جانِ فاطمہ! مرا پیارا کدھر گیا
اماں کی زندگی کا سہارا کدھر گیا
وہ تین دن کی پیاس کا مارا کدھر گیا
سیدانیوں کی آنکھ کا تارا کدھر گیا
مرتی ہوں، اپنے سروِ سہی قد کو دیکھ لوں
اک بار پھر شبیہِ محمد کو دیکھ لوں"
باتیں یہ سُن کے کہنے لگے شاہِ بحر و بر
"یارب! جدا نہ ہو کسی ماں سے جواں پسر
بانو! اُسے بلاؤں؟ کہاں ہے وہ سیم بر؟
ہم شکلِ مصطفےٰ! تو گئے فاطمہ کے گھر
ہر دُکھ میں صبر کرتے ہیں، جو حق شناس ہیں
جس نے تمھیں دیا تھا، وہ اب اُس کے پاس ہیں

"جاگے ہوئے تھے رات کے، نیند آگئی انھیں — ہے ہے! منافقوں کی نظر کھا گئی انھیں
مخفی کیا بہت، پہ اجل پا گئی انھیں — صحرائے کربلا کی فضا بھا گئی انھیں
زندہ نہ ہوگا لال، اگر مر بھی جاؤ گی
بانو کوئی گھڑی میں ہمیں بھی نہ پاؤ گی

"جاتے ہیں ہم وہیں، کہ جہاں ہے وہ لالہ فام — دے دو، جو اپنے لال کو دینا ہو کچھ پیام"
سُن کر یہ ذکر، ہوش میں آئی وہ تشنہ کام — سمجھی کہ گھر تباہ ہوا اب، چلے امام
خنجر سے حلقِ شاہ کے کٹنے کا طور ہے
بستی اُجڑ کے تخت اُلٹنے کا طور ہے

دامن پکڑ کے شاہ کا بولی وہ دل فگار — "اے ابنِ فاطمہ! یہ کنیز آپ کے نثار
بعد آپ کے جو لوٹنے آئیں ستم شعار — بیٹھے کہاں یہ بے کس و غمگین و سوگوار
کچھ حق میں اس کنیز کے فرما کے جائیے
صاحب کوئی جگہ مجھے بتلا کے جائیے"

فرمایا شہ نے "حافظ و حامی ہے ذوالجلال — زہرا کی بیٹیوں کی رہو تم شریکِ حال
زینب کو دیکھو، سر پہ نہ بھائی، نہ دونوں لال — صاحب! تمھارے ساتھ ہے عابد سا خوش خصال
بے وارثوں کا وارث و والی الٰہ ہے
دیکھو ڈگیں نہ پاؤں، کہ مشکل یہ راہ ہے

"لو الوداع، لاش پہ اب آ کے روئیو — لیکن نہ خاک اُڑا کے نہ چلّا کے روئیو
زانو پہ سر کو شرم سے نہوڑا کے روئیو — قبرِ رسولِ پاک پہ ہاں جا کے روئیو
لٹنے میں صبر، شکر تباہی میں چاہیے
رونا بشر کو خوفِ الٰہی میں چاہیے"

یہ سن کے حشر ہو گیا فریاد و آہ سے — سیدانیاں لپٹ گئیں زہرا کے ماہ سے
ٹھہرا گیا نہ پھر شہ عالم پناہ سے — نکلے حسین روتے ہوئے خیمہ گاہ سے
جو تھا فلک ضیا سے جلو خانہ بن گیا
خورشید شمع حسن کا پروانہ بن گیا

مل کر حرم سے در پہ جو شاہِ غیور آئے — اک غل ہوا حضور کرامت ظہور آئے
لاؤ فرس کو ڈیوڑھی پہ جلدی، حضور آئے — اعمیٰ بھی ہو تو آنکھ کی پتلی میں نور آئے
پھرتا تھا سر پہ چتر سلیماں جناب کے
سایہ تھا ایک بیچ میں دو آفتاب کے

ہٹا نہ تھا کوئی، نہ ادھر اور اُدھر — پر قدسیوں کی صف تھی برابر ادھر اُدھر
مڑ مڑ کے دیکھتے تھے جو سرور ادھر اُدھر — گرتی تھی برق حسن چمک کر ادھر اُدھر
جلوے دکھا رہی تھی ضیا ہاتھ پاؤں کی
ایک چاندنی بچھی ہوئی تھی دھوپ چھاؤں کی

غل تھا فلک کا رنگ بدلتا ہے دیکھ لو — ذروں سے آفتاب بھی جلتا ہے، دیکھ لو
لو جوبن آج دن کا بھی ڈھلتا ہے دیکھ لو — قدموں پہ نور آنکھوں کو ملتا ہے، دیکھ لو
نقش اس قدم کے چاند سے روشن دو چند ہیں
مجمر ہے آسماں، تو ستارے سپند ہیں

گھوڑے کی تعریف

آمد فرس کی تھی دلہن آتی ہے جس طرح — تھم تھم کے نکہت چمن آتی ہے جس طرح
تصویر آہوئے ختن آتی ہے جس طرح — یا شمع سوئے انجمن آتی ہے جس طرح
باہم طیور کہتے تھے، کبک دری ہے یہ
گھوڑے چراغ پا تھے کہ بے شک پری ہے یہ

آیا عجب شکوہ سے اسپِ ستمگر رکاب — تھامے تھی فتح زین کا دامن، ظفر رکاب
چشمک زنی ہلال پہ کرتی تھی ہر رکاب — حلقہ تھا نورِ مہر کا، یا جلوہ گر رکاب
فتراک تھے، کہ کھولے ہوئے تھے عقاب پر
زیں پر تھا گرد پوش، کہ ابر آفتاب پر

اختر خجل ہیں زین جواہر نگار سے — ذرّوں نے چن لیے ہیں ستارے غبار سے
تھمتا ہے کب سوار فراست شعار سے — گردن میں ہاتھ باگ نے ڈالے ہیں پیار سے
نازاں ہے خود رکاب کے پائے کو دیکھ کر
بل کر رہا ہے خاک پہ سائے کو دیکھ کر

قربان اس نگاورِ ضیغم شکار کے — پامال کر دے شیر کو ٹاپوں سے مار کے
شائستگی کو پوچھیے دل سے سوار کے — چاہے، تو ایک طفل چڑھے باگ اتار کے
رکھ دے قدم، تو رنگ نہ میلا ہو پھول کا
پیارا فرس ہے راکبِ دوشِ رسول کا

خوش رو و خوش خرام و خوش اندام و خوش لگام — خوش خو و خوش مزاج و ادا فہم و تیز گام
جاں دار و شوخ چشم و سعید و خجستہ کام — گل پوش و تیز ہوش و سمن گوش و لالہ فام
غازی تھا، سرفراز تھا، عالی دماغ تھا
گویا ہوا کے دوش پہ اک زندہ باغ تھا

چاروں سموں سے بدر خجل، نعل سے ہلال — کھیلیں شکارِ شیر، یہ آنکھیں ہیں وہ غزال
کہیے نہ یال، حور نے بکھرا دیے ہیں بال — پھرنے پہ جھوم جھوم کے صدقے پری کی چال
رستے ہیں یاد گنبدِ نیلی رواق کے
دُلدُل کی تیزیاں ہیں، طرارے براق کے

سینہ کشادہ، تنگ کمر، چُست جوڑ بند گردن میں خم ہلال کا اور اس پہ سربلند
جاں باز، بردبار، عدو کش، ظفر پسند بجلی کسی جگہ، کہیں آہو، کہیں پرند
سرعت ہے ابر کی، تو لطافت ہوا کی ہے
اتنے ہنر فرس میں، یہ قدرت خدا کی ہے

لو اب سوار ہوتا ہے حیدر کا یادگار تھامے رکاب کون، نہ یاور، نہ غم گسار
رو کر فرس سے کہتے ہیں شبیر نام دار "اے ذوالجناح! دیکھ یہ نیرنگ روزگار
سب دوپہر میں ابنِ علی سے جُدا ہوئے
جو تیرے گرد رہتے تھے، وہ دوست کیا ہوئے

"ایسے کسے ملے ہیں رفیقانِ باوفا پیشِ خدا جلیل ہے ان سب کا مرتبا
ہوتے جہاں میں آج جو پیغمبر خدا کرتے ہر اک شہید کا ماتم جُدا جُدا
شانہ بتول بالوں میں کرتی نہ عمر بھر
چادر سیاہ سر سے اُترتی نہ عمر بھر"

یہ سُن کے ذوالجناح تو روتا تھا زار زار چلاتی تھی یہ زوجۂ عباس نام دار
"صاحب! اُٹھو ترائی سے میں آپ کے نثار آقا سوار ہوتے ہیں، آیا ہے راہوار
یاں آکے ساتھ جاؤ امامِ غیور کے
سایہ کرو کہ دھوپ ہے سر پر حضور کے"

بانو پکارتی تھی کہ "اکبر! کدھر ہو تم؟ بیٹا! پدر کے کوچ کے دن بے خبر ہو تم
تھامو رکاب، باپ کے پیارے پسر ہو تم اماں کا گھر اجڑتا ہے، دادی کے گھر ہو تم
بازو کو تھامو، ہاتھ میں حضرت کے ہاتھ دو
بیٹا ضعیفی وقت میں بابا کا ساتھ دو"

لکھا ہے، یاں بجامِ فرس پر تھا دستِ شاہ
فریادِ واحسین سے ہلتی تھی بارگاہ
خیمے سے نکلی اک زنِ بالا بلند، آہ!
رخ پر نقاب، پانوٗں میں موزے، عبا سیاہ
حسنِ بتول و شانِ علی کا ظہور تھا
گویا لباسِ کعبہ میں خالق کا نور تھا

پردہ تھا، پر جھکی ہوئی آئی وہ دل کباب
تھامی لرزتے ہاتھوں سے رہوار کی رکاب
گھوڑے پہ جلوہ گر ہوئے شاہِ فلک جناب
بیت الشرف میں پھر گئی وہ مثلِ آفتاب
جس کا یہ ذکر ہے، وہ نواسی نبی کی تھی
زینب، بہن حسین کی، بیٹی علی کی تھی

رن کو سواریِ شہِ جن و بشر چلی
پیچھے تمام فوجِ ملک ننگے سر چلی
آمد گھوڑے کے ساتھ فاطمہ تھامے جگر چلی
شبدیز کیا چلا، کہ نسیمِ سحر چلی
طبقہ تمام نورِ سواری سے عرش تھا
سونے کی تھی زمیں، تو ستاروں کا فرش تھا

حیراں زمیں کے نور سے ہے چرخِ لاجورد
مانندِ کہربا ہے رخِ آفتاب زرد
ہے رشکِ فضائے ارم وادیِ نبرد
اٹھتا ہے خاک سے تتقِ نور جائے گرد
حیرت سے حاملانِ فلک ان کو تکتے تھے
ذرّے نہیں، زمیں پہ ستارے چمکتے تھے

ہے آبِ نہر صورتِ آئینہ جلوہ گر
تاباں ہے مثلِ چشمۂ خورشید ہر بھنور
لہریں بسانِ برق چمکتی ہیں سر بسر
پانی پہ مچھلیوں کی ٹھہرتی نہیں نظر
یہ آب و تاب ہے، کہ گہر آب آب ہیں
دریا تو آسماں ہے، ستارے حباب ہیں

پھیلا جو نورِ مہرِ امامت دمِ زوال
ذرّوں سے واں کے آنکھ ملانا ہوا محال
سارے نہال فیضِ قدم سے ہوئے نہال
اختر بنے جو پھول، تو شاخیں بنیں ہلال
پتّے تمام آئینۂ نور ہو گئے
صحرا کے نخل سب شجرِ طور ہو گئے

وہ شان، وہ شکوہ، وہ شوکت جناب کی
اللہ ری ضو! جھپکتی ہے آنکھ آفتاب کی
تصویر ہیں جنابِ رسالت مآب کی
پیری دکھا رہی ہے لطافت شباب کی
بر میں نبی کا جامۂ عنبر شمامہ ہے
رنگت تو پھول سی ہے، گلابی عمامہ ہے

وہ روے دل فروز، وہ زلفوں کا پیچ و تاب
گویا کہ نصفِ شب میں نمایاں ہے آفتاب
ابرو کی ذوالفقار سے زہرہ عدو کا آب
آنکھیں وہ، جن سے نرگسِ فردوس کو حجاب
پُتلی کا رعب سب پہ عیاں ہے خدائی میں
بیٹھا ہے شیر پنجوں کو ٹیکے ترائی میں

حوریں ہیں گرد ساغرِ کوثر لیے ہوئے
قدسی جلو میں ہیں طبقِ نور لیے ہوئے
جبریل ہیں نجات کا دفتر لیے ہوئے
جھولی میں ہے نسیمِ گُلِ تر لیے ہوئے
لُٹتے ہیں پھول وادیِ عنبر سرشت میں
دولھا برات لے کے چلا ہے بہشت میں

کیونکر بیاں ہو شوکت و شانِ پیمبری
عاجز ہیں یاں فرزدق و حسّان و حمیری
طاقت یہ کس میں ہے کہ لکھے زورِ حیدری
دوڑے کمیتِ خامہ تو کھائے سکندری
ذرّے سے وصفِ نیّرِ تاباں ہو کس طرح
اک مور سے ثنائے سلیماں ہو کس طرح

پہنچا جو اس شکوہ سے خیبر اُورا کا لال ۔۔۔ کانپے جبل، لرزنے لگا عرصۂ قتال
ڈٹے جو مورچے، تو پکارے وہ بدخصال ۔۔۔ بھاگو، کہ آئے شیر الٰہی پئے جدال
دیکھا جو رُعبِ قبلۂ عالی مقام کو
علموں نے جھک کے ہاتھ بڑھائے سلام کو

بڑھ کر صدا نقیب نے دی روبرو نگاہ ۔۔۔ دشمن ترے ذلیل، معاند ترے تباہ
آواز دی ظفر نے کہ اے معدلت پناہ! ۔۔۔ تاباں رہے ستارۂ اقبال عزّ و جاہ
زہرہ عدو کا آب، کلیجہ لہو رہے
ہر معرکے میں تیغِ علی سُرخ رو رہے

حد سے فزوں تھی کثرتِ فوجِ ستم شعار ۔۔۔ لکھا ہے راویوں نے چھ لاکھ اور دس ہزار
پیدل تھے بے حساب، تو تھے لاتعد سوار ۔۔۔ فوجوں کا دشت چپّے بھی ممکن نہ تھا شمار
پیکِ خیال جا کے پھر آتا تھا راہ سے
پنہاں تھی کربلا کی زمیں سب نگاہ سے

ہر صف میں برچھیاں جو ہزاروں چمکتی تھیں ۔۔۔ نوکیں وہ تیز تھیں، کہ دلوں میں کھٹکتی تھیں
نیزے تلے ہوئے تھے، سنانیں چمکتی تھیں ۔۔۔ ترکش کھلے ہوئے تھے، کمانیں کڑکتی تھیں
سنگیں دلوں نے ہاتھوں میں پتھر اُٹھائے تھے
تیغوں کے ساتھ گرزِ گراں سر اُٹھائے تھے

کچھ سوچ کر پلٹ گئے حضرت بحالِ زار ۔۔۔ خیمے سے لائے ہاتھوں پہ اک طفلِ شیرخوار ۔۔۔ پیاسے بچے
دن کو ہوا قرانِ مہ و مہر آشکار ۔۔۔ مرجھا گیا تھا پیاس سے لیکن وہ گل عذار ۔۔۔ خیمے سے لانا
تھا فرطِ غش سے ننھا سا منکا ڈھلا ہوا
باندھے ہوئے تھا مٹھیاں، منھ تھا کھلا ہوا

چھوٹا سا ایک سبز عمامہ تھا زیبِ سر
ماتھا جھنڈولے بالوں میں، ہالے میں جیسے قمر
جٹّی بھویں وہ، جن پہ تصدق دلِ بدر
آنکھیں تو نرگسی پہ نقاہت زیادہ تر
سائے میں دامنِ خلفِ بوتراب کے
رُخسار تھے کہ پھول کھِلے تھے گلاب کے

پھیلا ہوا وہ آنکھوں میں کاجل اِدھر اُدھر
خشکیدہ ہونٹ، موے مژہ آنسوؤں سے تر
باچھوں سے تھا نمود جمے دودھ کا اثر
ہاتھوں میں نیلے ڈورے تھے، ہیکل تھی سینے پر
ننھے سے دل کو ماں کے بچھڑنے کا درد تھا
رن کی ہوائے گرم سے جسم اُس کا سرد تھا

روشن گلا تھا شمعِ تجلّیِ طورِ حُسن
مثلِ ستارۂ سحری تھا وفورِ حُسن
گھیرے ہوئے تھا ننھی سی ہنسلی کو نورِ حُسن
ہوتا ہے جس طرح مہِ نو سے ظہورِ حُسن
آثارِ مرگ پھول سے رُخ پر نمود تھے
ہچکی لگی ہوئی تھی مسوڑے کبود تھے

صدمے سے پیاس کے رُخِ معصوم تھا جو زرد
حضرت فلک کو دیکھ کے بھرتے تھے آہِ سرد
ہچکی جب اُس کو آتی تھی اُٹھتا تھا دل میں درد
آنسو رواں تھے آنکھوں سے، رُخ پر جمی تھی گرد
پانی کی جستجو تھی شہِ خوش صفات کو
تکتے تھے چشمِ یاس سے نہرِ فرات کو

جاری یہ لب پہ تھا کہ "نہ آیا تجھے حجاب
اے نہر! مر گئے مرے بچے بغیر آب
دو دن سے خشک ہے چمنستانِ بوتراب
محشر میں دے گی ساقیِ کوثر کو کیا جواب
سیراب سب چرند و پرند اور پیاسے ہم
شکوہ ترا کریں گے رسولِ خدا سے ہم"

پانی کا سوال

یہ کہہ کے شامیوں کو صدا دی بہ چشمِ تر — کہنا ہے کچھ مجھے، عمرِ سعد ہے کدھر؟
نکلا یہ سن کے فوج سے ظالم بہ کرّ و فر — پہنے لباسِ فاخرہ، باندھے ہوئے کمر
خادم تھے ساتھ ہاتھوں میں عہدے لیے ہوئے
اور ایک شخص چتر کا سایہ کیے ہوئے

بولے دکھا کے بچے کو شاہِ فلک سریر — "مرتا ہے پیاس سے یہ مرا کودکِ صغیر
پانی ملا ہے کب سے، نہ ممکن ہوا ہے شیر — للہ اس غریب پہ کر رحم اے امیر!
مہماں ہے کوئی آن کا ہونٹوں پہ جان ہے
اس کا قصور کیا ہے کہ یہ بے زبان ہے

"نالاں ہے تجھ سے روحِ رسولِ فلک اساس — اتنا بھی دل نہ سخت کر اے ناخدا شناس!
موجود ہیں صراحیاں پانی کی تیرے پاس — اک گھونٹ دے اسے کہ ہے سولا پہر کی پیاس
بچے پہ ظلم صاحبِ ایماں سے دور ہے
چھوٹے سے میہمان کی خاطر ضرور ہے"

یہ کہہ کے چپ ہوئے جو شہنشاہِ بحر و بر — دل دشمنوں کے ہل گئے تھرّا گئے جگر
رویا جھکا کے سر پسرِ سعدِ خیرہ سر — فولاد موم ہو گیا اللہ رے اثر!
مضطر تمام فوج کے پیر و جواں ہوئے
آنکھوں سے مرکبوں کے بھی آنسو رواں ہوئے

بولے یہ ابنِ سعد سے سردارِ فوجِ شام — "واللہ اے امیر! یہ ہے رحم کا مقام
دیتے ہیں اس کو آب جو کافر ہو تشنہ کام — یہ بے کس و غریب تو سیّد ہے اور امام
کچھ شرم بھی ہے شرطِ مسلماں کے واسطے
دے حکم آب اصغرِ ناداں کے واسطے"

بچے کی شہادت

پیہم پکارتے تھے شہِ آسماں جناب　　"مسلم ہو تم، تو رحم نبی سے کرو حجاب"
منھ پھیرتے تھے سب، کوئی دیتا نہ تھا جواب　　نکلا پرے سے حرملۂ خانماں خراب
جلدی کماں میں جوڑ کے سرکش نے تیر کو
تاکا نگاہِ قہر سے حلقِ صغیر کو

کتنا بچایا شہ نے، اجل سے نہ بس چلا　　کڑکی اُدھر کمان، اِدھر چھد گیا گلا
آنسو بھر آئے آنکھوں میں، منکا جونہی ڈھلا　　آنکھوں سے شہ نے آنکھیں ملیں، منھ سے منھ ملا
جو حسرتیں تھیں دل میں، قضا نے نکال دیں
ننھی سی بانہیں باپ کی گردن میں ڈال دیں

جس دم تڑپ کے مر گیا وہ طفلِ شیرخوار　　چھوٹی سی قبر تیغ سے کھودی بہ حالِ زار
بچے کو دفن کر کے پکارا وہ ذی وقار　　"اے خاکِ پاک! حرمتِ مہماں نگاہ دار
دامن میں رکھ اسے، جو محبت علی کی ہے
دولت ہے فاطمہ کی، امانت علی کی ہے"

دوبارہ میدان میں آمد

یہ کہہ کے آئے فوج پہ تولے ہوئے حسام　　آنکھیں لہو تھیں رونے سے، چہرہ تھا سُرخ فام
زیبِ بدن کیے تھے بصد عزّ و احتشام　　پیراہنِ مطہرِ پیغمبرِ انام
حمزہ کی ڈھال، تیغ شہِ لافتا کی تھی
بر میں زرہ جنابِ رسولِ خدا کی تھی

رستم تھا درع پوش، کہ پاکھر میں راہوار　　جرّار، بردبار، سُبک رو، وفا شعار
کیا خوش نما تھا زین طلاکار و نقرہ کار　　اکسیر تھا، قدم کا جسے مل گیا غبار
خوش خو تھا، خانہ زاد تھا، دلدل نژاد تھا
شبیر بھی سخی تھے، فرس بھی جواد تھا

اعدا کی سمت غیظ میں سلطانِ دیں بڑھے — گیتی کے تھام لینے کو روح الامیں بڑھے
مانندِ شیرِ نر کہیں ٹھہرے، کہیں بڑھے — گویا علی اُلٹتے ہوئے آستیں بڑھے
جلوہ دیا جری نے عروسِ مصاف کو
مشکل کشا کی تیغ نے چھوڑا غلاف کو

کاٹھی سے اس طرح ہوئی تیغِ دوسر جدا — جیسے سوادِ شب سے بیاضِ سحر جدا
نصرت کا آئینہ تھا جدا، اور گہر جدا — محمل جدا تھا، لیلیِ فتح و ظفر جدا
تیغِ کشیدہ دستِ شہِ بحر و بر میں ہے
طومار ہاتھ میں ہے، لفافہ کمر میں ہے

نکلی جو رن میں تیغِ حسینی غلاف سے — اُڑنے لگے شرر دمِ خارا شگاف سے
بجلی بڑھی چمک کے جو دشتِ مصاف سے — صاف آئی الاماں کی صدا کوہِ قاف سے
طبقے زمیں کے صورتِ گہوارہ ہل گئے
دَب کر پہاڑ خاک کے دامن سے مل گئے

سیفی چلی، کہ سیفِ شہِ لافتا چلی — گویا صفوں پہ کھولے ہوئے منھ بلا چلی
بن میں سمومِ قہر و عتابِ خدا چلی — جھونکوں سے جس کے اُڑتے ہیں سر وہ ہوا چلی
آواز الاماں کی سپہرِ بریں پہ تھی
بڑھ کر جو یوں پھری، صفِ اول زمیں پہ تھی

غل تھا کہ وہ چمکتی ہوئی آئی، یہ گری — برچھی سے اُڑ گئی وہ سناں، یہ گرہ گری
ترکش کٹا، کمانِ کیانی سے زہ گری — یہ سر گرا، وہ خود گرا، وہ زرہ گری
آتی ہے یوں لشکروں پہ تباہی اسی طرح
گرتی ہے برقِ قہرِ الٰہی اسی طرح

جس صف پہ وار کرتے تھے سلطانِ بحر و بر | اُڑتی تھی کٹ کے صورتِ کاغذ ہر اک سپر
چھٹتی تھیں، بھاگی جاتی تھیں، گرتے تھے خاک پر | قبضوں سے تیغیں، جسموں سے روحیں، تنوں سے سر
پے تھے قدم، گریز کے کوچے بھی بند تھے
شعلہ وہ تیغ تھی، سرِ اعدا سپند تھے

آئی چمک کے غول پہ جب، سر گرا گئی | دم میں جمی صفوں کو برابر گرا گئی
ایک ایک قصرِ تن کو زمیں پر گرا گئی | سیل آئی زور شور سے جب، گھر گرا گئی
آپہنچا اس کے گھاٹ پہ جو، مر کے رہ گیا
دریا لہو کا تیغ کے پانی سے بہہ گیا

اس آب پر یہ شعلہ فشانی! خدا کی شان | پانی میں آگ، آگ میں پانی! خدا کی شان
خاموش اور تیز زبانی! خدا کی شان | استادہ آب میں یہ روانی! خدا کی شان
لہر آئی جب، اتر گیا دریا چڑھا ہوا
نیزوں تھا ذوالفقار کا پانی بڑھا ہوا

خودِ سرِ عدو تھے حباب اُس کے سامنے | موجِ زرہ تھی نقش بر آب اُس کے سامنے
کیا مُنھ تھا، دے جو تیغ جواب اُس کے سامنے | بڑھنے کی تھی سپر کو نہ تاب اُس کے سامنے
اللہ کا غضب ہے، یہ جانے ہوئے تھے سب
لوہے کو ذوالفقار کے مانے ہوئے تھے سب

چاروں طرف کمانِ کیانی کی وہ ترنگ | رہ رہ کے ابرِ شام سے وہ بارشِ خدنگ
وہ شورِ صیحۂ فرسِ ابلق و شبرنگ | وہ لو، وہ آفتاب کی تابندگی، وہ جنگ
پھنکتا تھا دشتِ کیں، کوئی دل تھا نہ چین سے
اُس دن کی تاب و تب کوئی پوچھے حسین سے

گرمی کی شدت

گرمی کا روزِ جنگ کی کیونکر کروں بیاں　　ڈر ہے، کہ مثلِ شمع نہ جلنے لگے زباں
وہ لوں کہ الحذر، وہ حرارت کہ الاماں　　رن کی زمیں تو سرخ تھی، اور زرد تھا آسماں

آبِ خنک کو خلق ترستی تھی خاک پر
گویا ہوا سے آگ برستی تھی خاک پر

وہ لوں، وہ آفتاب کی حدت، وہ تاب و تب　　کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثالِ شب
خود نہرِ علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب　　خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب

اڑتی تھی خاک، خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

جھیلوں سے جانور نہ اٹھتے تھے تا بہ شام　　مسکن میں مچھلیوں کے سمندر کا تھا مقام
آہو جو کاہلے تھے، تو چیتے سیاہ فام　　پتھر پگھل کے رہ گئے تھے مثلِ موم خام

سرخی اڑی تھی پھولوں سے، سبزی گیاہ سے
پانی کنوؤں میں اترا تھا سائے کی چاہ سے

آبِ رواں سے منہ نہ اٹھاتے تھے جانور　　جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر ادھر ادھر
مردم تھے سات پردوں کے اندر عرق میں تر　　خس خانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر

گر چشم سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

شیر اٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے　　آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدر غبار سے　　گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے

گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا، جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پر تھا شعلۂ جوّالہ کا گماں
انگارے تھے حباب، تو پانی شرر فشاں
منھ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں
تہ پر تھے سب نہنگ، مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ، گرمیِ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخِ موج تک آئی، کباب تھی

آئینۂ فلک کو نہ تھی تاب و تب کی تاب
چھپنے کو برق چاہتی تھی دامنِ سحاب
سب سے سوا تھا گرم مزاجوں کو اضطراب
کافورِ صبح ڈھونڈھتا پھرتا تھا آفتاب
بھڑکی تھی آگ گنبدِ چرخِ اثیر میں
بادل چھپے تھے سب کرۂ زمہریر میں

اس دھوپ میں کھڑے تھے اکیلے شہِ امم!
نہ دامنِ رسول تھا، نہ سایۂ علم
شعلے جگر سے آہ کے اٹھتے تھے دم بدم
اودے تھے لب، زبان میں کانٹے، کمر میں خم
بے آب تیسرا تھا جو دن میہمان کو
ہوتی تھی بات بات میں لکنت زبان کو

سر پر لگائے تھا پسرِ سعد چترِ زر
خادم کئی تھے مروحہ جنباں ادھر ادھر
کرتے تھے آب پاش مکرر زمیں کو تر
فرزندِ فاطمہ پہ نہ تھا سایۂ شجر
وہ دھوپ دشت کی، وہ جلال آفتاب کا
سونلا گیا تھا رنگ مبارک جناب کا

بیعت کا سوال اور امام کی برہمی

کہتا تھا ابنِ سعد کہ "اے آسماں جناب!
بیعت جو کیجیے اب بھی، تو حاضر ہے جامِ آب"
فرماتے تھے حسین کہ "او خانماں خراب!
دریا کو خاک جانتا ہے ابنِ بوتراب
فاسق ہے، پاس کچھ تجھے اسلام کا نہیں
آبِ بقا ہو اب، تو مرے کام کا نہیں

"کہہ دوں، تو خوان لے کے خود آئیں ابھی خلیل
چاہوں، تو سلسبیل کو دم میں کروں سبیل
کیا جام آب کا مجھے تو دے گا، او ذلیل!
بے آبرو خسیس، ستمگر، دنی، بخیل
جس پھول پر پڑے ترا سایہ، وہ بو نہ دے
کھلوائے فصد تو، تو کبھی رگ لہو نہ دے

"گر جم کا نام لوں، تو ابھی جام لے کے آئے
کوثر یہیں رسول کے احکام لے کے آئے
روح الامیں زمیں پہ مرا نام لے کے آئے
لشکر ملک کا فتح کا پیغام لے کے آئے
چاہوں جو انقلاب، تو دنیا تمام ہو
اُلٹے زمین یوں کہ نہ کوفہ، نہ شام ہو"

اے شہسوارِ ملکِ سخن! صفدری دکھا
گیتی کو زلزلہ ہو، وہ زور آوری دکھا
جمعیتِ سپاہ کی پھر ابتری دکھا
ہاں زور و شورِ معرکۂ حیدری دکھا
کٹ جائیں رنگ، سینۂ اعدا فگار ہو
پڑھنے میں دونوں لب جو کھلیں، ذوالفقار ہو

اے تیغ آبدار زباں! اور تیز ہو
سرگرم کشت و خون و قتال و ستیز ہو
دریا لہو کا وادیِ ہنگامہ خیز ہو
لگ جائے آگ دشت میں، یوں شعلہ ریز ہو
نقشہ ہو صاف تیغ علی کی صفائی کا
دکھلا دوں ہر ورق میں مرقع لڑائی کا

اللہ ری لڑائی میں شوکت جناب کی!
سونلائے رنگ میں تھی ضیا آفتاب کی
سوکھے وہ لب کہ پنکھڑیاں تھیں گلاب کی
تصویر ذوالجناح پہ تھی بوتراب کی
ہوتا تھا غل، جو کرتے تھے نعرے لڑائی میں
بھاگو، کہ شیر گونج رہا ہے ترائی میں

پہنچے جو شبلِ شیر جھپٹ کر اِدھر اُدھر — سر گر پڑے حسام سے کٹ کر اِدھر اُدھر
آیا گیا فرس جو سمٹ کر اِدھر اُدھر — ڈھالوں کا ابر رہ گیا پھٹ کر اِدھر اُدھر
جاروب تھی، کہ سیفِ میانِ مصاف تھی
دریا کی راہ حملۂ اول میں صاف تھی

بچھ بچھ گئیں صفوں پہ صفیں، وہ جہاں چلی — چمکی تو اُس طرف، اِدھر آئی، وہاں چلی
دونوں طرف کی فوج پکاری کہاں چلی — اس نے کہا اِدھر، وہ پکاری یہاں چلی
مُنہ کس طرف ہے، تیغ زنوں کو خبر نہ تھی
سر گر رہے تھے، اور تنوں کو خبر نہ تھی

اللہ رے خوف تیغِ شہِ کائنات کا! — زہرہ تھا آب خوف کے مارے فرات کا
دریا پہ حال یہ تھا ہر اک بد صفات کا — چارہ فرار کا تھا، نہ یارا ثبات کا
غل تھا، کہ برق گرتی ہے ہر درع پوش پر
بھاگو، خدا کے قہر کا دریا ہے جوش پر

ہر چند مچھلیاں تھیں زرہ پوش سر بسر — مُنہ کھولے چھپتی پھرتی تھیں لیکن اِدھر اُدھر
بھاگی تھی موج چھوڑ کے گرداب کی سپر — تھے تہ نشیں نہنگ، مگر آب تھے جگر
دریا نہ تھمتا خوف سے اس برق تاب کے
لیکن پڑے تھے پانوں میں چھالے حباب کے

آیا خدا کا قہر، جدھر سن سے آگئی — کانوں میں الاماں کی صدا رن سے آگئی
دو کر کے خود، زین پہ جوشن سے آگئی — کھنچتی ہوئی زمین پہ توسن سے آگئی
بجلی گری جو خاک پہ تیغِ جناب کی
آئی صدا زمین سے 'یا بو تراب' کی

پس پس کے کش مکش میں کماں دار مر گئے | چلّے تو سب چڑھے رہے، بازو اُتر گئے
گوشے کٹے کمانوں کے، تیروں کے پر گئے | مقتل میں ہو سکا نہ گزارا، گزر گئے
دہشت سے ہوش اُڑے ہوئے تھے ہر اک دہم کے
سوفار کھول دیتے تھے مُنہ سہم سہم کے

تیر افگنی کا جن کی ہر اک شہر میں تھا شور | گوشہ کہیں نہ ملتا تھا اُن کو سوائے گور
تاریک شب میں جن کا نشانہ تھی چشمِ مور | لشکر میں خوفِ جاں نے اُنھیں کر دیا تھا کور
ہوش اُڑ گئے تھے فوجِ ضلالت نشان کے
پیکاں کو زہ میں رکھتے تھے سوفار جان کے

سہمے ہوئے تھے یوں کہ کسی کو نہ تھی خبر | پیکاں کدھر ہے تیر کا، سوفار ہے کدھر
مردم کی کش مکش سے کمانوں کو تھا یہ ڈر | گوشوں کو ڈھونڈھتی تھیں زمیں پر جھکائے سر
ترکش سے کھینچے تیر کوئی، یہ جگر نہ تھا
سپر پہ جس نے ہاتھ رکھا، تن پہ سر نہ تھا

عاری تھے تیغِ شاہِ حجازی سے نیزہ باز | پیہم اُلٹ کے گرتے تھے تازی سے نیزہ باز
رُکتے تھے ہاتھ دست درازی سے نیزہ باز | باز آئے اپنی شعبدہ بازی سے نیزہ باز
یوں تیغ سے کھول دیتی تھی نیزے کے بند کو
آتش پہ ڈال دے کوئی جیسے سپند کو

کٹ کٹ کے ذوالفقار سے گرتے تھے خاک پر | پہنچوں سے ہاتھ، شانوں سے بازو، تنوں سے سر
قبضے سے تیغ، بر سے زرہ، ہاتھ سے سپر | برچھی سے پھل، کمان سے زہ، زین سے تبر
ترکش کہیں پڑے تھے، نشانِ زری کہیں
پیکاں کہیں تھے، شست کہیں تھی، سری کہیں

پھرے رُخ کمانیں تیروں سے، چلّے کماں سے دور　　مرغانِ تیر بیٹھے ہوئے آشیاں سے دور
برچھوں سے پھل گرے، ہوئے خنجر سناں سے دور　　پیروں سے عقل دور، تہوّر جواں سے دور
تیغوں کی کچھ خبر تھی، نہ ڈھالوں کا ہوش تھا
نیزہ ہر اک سوار کو اک بارِ دوش تھا

دستے وہ مصر و زنگ کے، وہ فوجِ روم و شام　　دن دوپہر، وہ دشت کی گرمی، وہ ازدحام
تیغیں برہنہ ہو گئی تھیں چھوڑ کر نیام　　مانندِ شمع جل رہی تھیں برچھیاں تمام
تلواریں منہ چھپائے تھیں سائے میں ڈھال کے
خنجر بھی رہ گئے تھے زبانیں نکال کے

لوں چل رہی تھی رن میں، کہ اللہ کی پناہ!　　ڈھالوں کے رنگ ہو گئے تھے دھوپ میں سیاہ
برچھی کے پھل پہ ہوتا تھا شعلے کا اشتباہ　　گلخن بنی ہوئی تھی ہر اک آہنی کلاہ
گویا کہ قوس میں تھا گزر آفتاب کا
عالم تھا ہر خدنگ پہ تیرِ شہاب کا

گرمی میں پیاس تھی، کہ پھنکا جاتا تھا جگر　　اُف اُف کبھی کہا، کبھی چہرے پہ لی سپر
آنکھوں میں ٹیس اٹھی، جو پڑی دھوپ پر نظر　　چھپتے کبھی اِدھر، کبھی حملہ کیا اُدھر
کثرتِ عرق کے قطروں کی تھی روئے پاک پر
موتی برستے جاتے تھے مقتل کی خاک پر

سقّے پکارتے تھے یہ مشکیں لیے اُدھر　　بازارِ جنگ گرم ہے، ڈھلتی ہے دوپہر
پیاسا جو ہو، وہ پانی سے ٹھنڈا کرے جگر　　مشکوں پہ دوڑ دوڑ کے گرتے تھے اہلِ شر
کیا آگ لگ گئی تھی جہانِ خراب کو
پیتے تھے سب، حسین ترستے تھے آب کو

سیراب چھٹتے پھرتے تھے پیاسے کی جنگ سے — چلتی تھی ایک تیغ علی لاکھ رنگ سے
چمکی جو فرق پر، تو نکل آئی تنگ سے — رکتی نہ تھی سپر سے، نہ آہن، نہ سنگ سے
خالق نے منہ دیا تھا عجب آب و تاب کا
خود اس کے سامنے تھا پھپھولا حباب کا

یکتا برش میں، جوہر ذاتی میں، قدر میں — چمکی اُحد میں، خیبر و خندق میں، بدر میں
تیزی وہی تھی منہ کی اس آشوبِ غدر میں — چل کر سپر سے سر میں گئی، سر سے صدر میں
کھنچتے ہوئے کمر سے نیا رنگ ڈھنگ تھا
راکب تھا، نہ فرس تھا، نہ زیں تھا، نہ تنگ تھا

گر طبع میں کسی کے روانی ہوئی تو کیا؟ — کیا کہہ سکے گا، تیز زبانی ہوئی تو کیا؟
بالفرض قوتِ ہمہ دانی ہوئی تو کیا؟ — مثلِ انیس سحر بیانی ہوئی تو کیا؟
فقروں کا ذوالفقار کے مطلب عیاں نہ ہو
کٹ جائے ساری عمر، تو شمّہ بیاں نہ ہو

گھوڑے کی تعریف

اللہ ری شان! واہ رے حملے جناب کے! — خاک اُڑ گئی، جدھر گئے گھوڑے کو داب کے
دکھلا دیے وغا میں چلن بوتراب کے — فتراک تھے، کہ پر فرس لاجواب کے
پتلی جدھر سوار نے پھیری، وہ مڑ گیا
اُترا براق بن کے، پری ہو کے اُڑ گیا

پیکاں ہیں دو کنوتیاں ہنگامِ دار و گیر — حلقے سے یوں نکلتا ہے، جیسے کماں سے تیر
روئیں وہ نرم، جلد وہ باریک و بے نظیر — چینی پرند جس کے مقابل ہو، نہ حریر
ایسی سبک روی نہیں دیکھی شہاب میں
دوڑے، تو فرق آئے نہ مخمل کے خواب میں

کل کی طرح اشارے میں سو بار پھیر لو
بجلی ہے، جس طرف دم پیکار پھیر لو
کاوے میں شکل گنبد دوّار پھیر لو
نقطے کے گرد صورت پرکار پھیر لو
دوڑے بروئے آب، تو پتلی بھی تر نہ ہو
آنکھوں میں یوں پھرے، کہ مژہ کو خبر نہ ہو

پھرتا تھا کیا صفوں میں فرس جھوم جھوم کے
سرعت بلائیں لیتی تھی منہ چوم چوم کے
پامال تھے پرے سپہ شام و روم کے
غل تھا یہ غول میں پسر سعدِ شوم کے
رخش ایسا روم و رَے میں نہیں، شام میں نہیں
یہ شوخیاں تو ابلق ایّام میں نہیں

آہو کی آنکھ، شیر کی چتون، پری کی چال
وہ یال تھی، کہ حور نے بکھرا دیے تھے بال
گردن کے خم کو دیکھ کے ہو سرنگوں ہلال
پوچھے کوئی سوار سے شائستگی کا حال
اڑ کر نہ زین تک کبھی گرد قدم گئی
جب بس کہا، چمکتی ہوئی برق تھم گئی

وہ شہسوارِ دوشِ محمد کی راں باگ
کیا ٹھہرے دھوپ میں، کہ یہ سیماب ہے، وہ آگ
تلوار کیا، فرس کو بھی تھی دشمنوں سے لاگ
ایک ایک کو پکار رہا تھا، کہ بھاگ بھاگ
زور اِس سے چل سکے گا نہ رستم، نہ گیو کا
اس بیل تن کی ٹاپ طمانچہ ہے دیو کا

گھوڑے کی وہ تڑپ، وہ چمک تیغ تیز کی
سو سو صفیں کچل گئیں، جب جست و خیز کی
لاکھوں میں تھی نہ ایک کو طاقت ستیز کی
تھی چار سمت دھوم گریزا گریز کی
عاری جو ہو گئی تھیں وہ سب ذوالفقار سے
تیغوں نے منہ پھرا لیے تھے کارزار سے

گھوڑوں کی جست و خیز سے اٹھا غبار زرد　　گردوں میں مثل شیشۂ ساعت بھری تھی گرد
تودہ بنا تھا خاک کا مینائے لاجورد　　کوسوں سیاہ رتا رتھا سب وادی نبرد
پنہاں نظر سے نیّر گیتی فروز تھا
ڈھلتی تھی دوپہر، یہ نہ شب تھی نہ روز تھا

جنگل میں تھی علم جو وہ تیغ شرر فشاں　　تھرّا کے آسماں میں چھپتا تھا آسماں
غار اژدروں سے چھٹ گئے، شیروں سے نیستاں　　برپا تھا بر و بحر میں اک شور الاماں
مانندِ موج مچھلیوں میں اضطراب تھا
زہرہ ہر ایک سنگ کا پانی میں آب تھا

شہ کے غضب سے چاہتی تھی ہر کہاں اماں　　مضطر زمیں تھی، مانگتا تھا آسماں اماں
دیتے نہ تھے کسی کو امام زماں اماں　　ہر صف میں تھا یہ شور کہ مولا اماں اماں
جب شاہ حملہ کرتے تھے شیر خدا کی طرح
دانتوں میں خس پکڑتے تھے سب کہربا کی طرح

پھر تو یہ غل ہوا کہ دہائی حسین کی　　اللہ کا غضب ہے لڑائی حسین کی
دریا حسین کا ہے، ترائی حسین کی　　دُنیا حسین کی ہے، خدائی حسین کی
بیڑا بچایا آپ نے طوفاں سے نوح کا
اب رحم، واسطہ علی اکبر کی روح کا

دو پہلوانوں سے مقابلہ

چلایا ہاتھ مار کے زانو پہ ابنِ سعد　　"اے وا فضیحتا! یہ ہزیمت ظفر کے بعد
زیبا دلاوروں کو نہیں ہے خلافِ وعد"　　اک پہلواں یہ سُنتے ہی گرجا مثالِ رعد
نعرہ کیا کہ کرتا ہوں حملہ امام پر
"اے ابن سعد! لکھ لے ظفر میرے نام پر"

بالا قد و کلفت و تنومند و خیرہ سر
روئیں تن و سیاہ دروں، آہنیں کمر
ناوک پیام مرگ کے، ترکش اجل کا گھر
تیغیں ہزار ٹوٹ گئیں جس پہ، وہ سپر
دل میں بدی، طبیعت بد میں بگاڑ تھا
گھوڑے پہ تھا شقی، کہ ہوا پر پہاڑ تھا

تھا جسم نابکار سے عرصہ زرہ پہ تنگ
جوشن میں یوں تھا، دام میں ہو جس طرح نہنگ
خوں خوار، فتنہ ساز، دل آزار، خانہ جنگ
آنکھیں تو فرط غیظ سے سرخ، اور سیاہ رنگ
تیوری چڑھائی، دیکھ کے حضرت کو دور سے
آیا قریب سبط نبی کس غرور سے

ساتھ اس کے اور ایسے قد و قامت کا ایک یل
نکلیں کبود، رنگ سیہ، ابروؤں پہ بل
بدکار و بد شعار و ستمگار و پُر دغل
جنگ آزما، بھگائے ہوئے لشکروں کے دل
بھالے لیے، کسے ہوئے کمریں ستیز پر
نازاں وہ ضرب گرز پہ، یہ تیغ تیز پر

لشکر میں اضطراب تھا، فوجوں میں کھلبلی
سادات بے حواس، ہراساں دھنی بلی
ڈر تھا کہ اب حسین بڑھے، تیغ اب چلی
غل تھا ادھر ہیں مرحب و عنتر، ادھر علی
کون آج سربلند ہو، اور کون پست ہو
کس کی ظفر ہو، دیکھیے، کس کی شکست ہو

کھنچ جائے شکل حرب، وہ تدبیر چاہیے
دشمن بھی سب مقر ہوں، وہ تقریر چاہیے
تیزی زباں میں صورت شمشیر چاہیے
فولاد کا قلم دم تحریر چاہیے
نقشہ کھنچے گا صاف صف کارزار کا
پانی دوات چاہتی ہے ذوالفقار کا

نیزہ ہلا کے شاہ پہ آیا وہ خود پسند
مشکل کشا کے لال نے کھولے تمام بند
تیر و کماں سے بھی نہ ہوا کچھ وہ بہرہ مند
چلّہ اُدھر کھنچا کہ یہ چلی تیغ سربلند
وہ تیر کٹ گئے، جو دَر آتے تھے سنگ میں
گوشے نہ تھے کماں میں، نہ پیکاں خدنگ میں

ظالم اُٹھا کے گرز کو آیا جناب پر
طاری ہوا غضب خلفِ بوتراب پر
مارا جو ہاتھ، پاؤں جما کر رکاب پر
بجلی گری شقی کے سرِ پُر عتاب پر
بد ہاتھ میں شکست، ظفر نیک ہاتھ میں
ہاتھ اُڑ کے جا پڑا کئی ہاتھ، ایک ہاتھ میں

کچھ دست پاچہ ہو کے چلا تھا وہ نابکار
پنجے سے پر اجل کے کہاں بچ سکے شکار
واں اُس نے بائیں ہاتھ میں لی تیغ آبدار
یاں سر سے آئی پشت کے مہرے پہ ذوالفقار
قربان تیغ تیز، شہ نامدار کے
دو ٹکڑے تھے سوار کے، دو راہوار کے

پھر دوسرے پہ گرز اُٹھا کر پکارے شاہ
"کیوں ضربِ ذوالفقار پہ تو نے بھی کی نگاہ؟"
سرشار تھا شرابِ تکبّر سے روسیاہ
جاتا کہاں کہ موت تو روکے ہوئی تھی راہ
غل تھا اُسے اجل نے بڑھایا جو گھیر کے
لو دوسرا شکار چلا منھ میں شیر کے

آتا تھا وہ، کہ اسپ شہِ دیں پلٹ پڑا
ثابت ہوا، کہ شیر گرسنہ جھپٹ پڑا
تیغہ شقی نے ڈھال پہ مارا، تو پٹ پڑا
ضربت پڑی، کہ گنبدِ دوّار پھٹ پڑا
پیوندِ صدرِ زیں جسد و فرق ہو گیا
گھوڑا زمیں میں سینے تلک غرق ہو گیا

شہادت

آئی ندائے غیب کہ "شبیر! مرحبا! اس ہاتھ کے لیے تھی یہ شمشیر! مرحبا!
یہ آبروئے جنگ، یہ توقیر، مرحبا! دکھلا دی ماں کے دودھ کی تاثیر! مرحبا!
غالب کیا خدا نے تجھے کائنات پر
بس خاتمہ جہاد کا ہے تیری ذات پر

"بس اب نہ کرو وغا کی ہوس، اے حسین! بس دم لے ہوا میں چند نفس، اے حسین! بس
گرمی سے ہانپتا ہے فرس اے حسین! بس وقتِ نمازِ عصر ہے بس، اے حسین! بس
پیاسا لڑا نہیں کوئی یوں اژدحام میں
اب اہتمام چاہیے امت کے کام میں"

لبیک کہہ کے تیغ رکھی شہ نے میان میں پلٹی سپاہ، آئی قیامت جہان میں
پھر سرکشوں نے تیر لگائے کمان میں پھر کھل گئے لپک کے پھریرے نشان میں
بے کس امام ظلم شعاروں میں گھر گئے
تنہا حسین لاکھ سواروں میں گھر گئے

سینے پہ سامنے سے چلے دس ہزار تیر چھاتی پہ لگ گئے کئی سو ایک بار تیر
پہلو کے پار برچھیاں، سینے کے پار تیر ٹوٹے تھے دس، جو کھینچتے تھے تن سے چار تیر
یوں تھے خدنگ ظلِ الٰہی کے جسم پر
جس طرح خار ہوتے ہیں ساہی کے جسم پر

چلتے تھے چار سمت سے بھالے حسین پر ٹوٹے ہوئے تھے برچھیوں والے حسین پر
قاتل تھے خنجروں کو نکالے حسین پر یہ دکھ نبی کی گود کے پالے حسین پر!
تیرِ ستم نکالنے والا کوئی نہ تھا
گرتے تھے اور سنبھالنے والا کوئی نہ تھا

ناگاہ سوئے لاش پسر جا پڑی نظر
چلائے دل کو تھام کے سلطانِ بحر و بر

"اکبر! اٹھو، کہ گھوڑے سے گرتا ہے اب پدر
سوتے ہو تم دھرے ہوئے رخسار خاک پر

بھولے پدر کو نیند میں، قربان آپ کے
آؤ نمازِ عصر پڑھو ساتھ باپ کے"

"عباس نامدار! ترائی سے اٹھ کے آؤ
پھنکتا ہے قلب جل رہے ہیں سب جگر کے گھاؤ

چھڑکو مری زرہ پہ، جو پانی کہیں سے پاؤ
چلتے ہوئے عدم کے مسافر سے مل تو جاؤ

ہم سب کے کام آئے ہیں، پیتے ہیں رووئیے
بارہ پہر ہوئے کہ نہ لیٹے، نہ سوئیے ہیں

"گو بافضا یہ سرد ترائی ہو، اب اٹھو
ہم جاں بلب ہیں، ختم لڑائی ہو، اب اٹھو

نرغے میں فوجِ ظلم کے بھائی ہو، اب اٹھو
عباس! دھوپ چہرے پہ آئی ہو، اب اٹھو

غفلت کی نیند تم کو ہو، شبیر کیا کرے
میری طرح کسی کو نہ بے کس خدا کرے"

ڈوبے ہوئے تھے خون میں گیسو حسین کے
آنکھوں پہ کٹ کے آ پڑے ابرو حسین کے

زخمی تھے دونوں ساعد و بازو حسین کے
تیروں نے چھان ڈالے تھے پہلو حسین کے

تیغیں اِدھر ہوئی جو برابر سے چل گئیں
غش آ گیا، قدم سے رکابیں نکل گئیں

گرتے ہیں اب حسین فرس پر سے، ہے غضب!
چھوٹی لجام دستِ مطہر سے، ہے غضب!

پہلو شگافتہ ہوا خنجر سے، ہے غضب!
گردن ڈھلی، عمامہ گرا سر سے، ہے غضب!

قرآن رحل زیں سے سرِ فرش گر پڑا
دیوارِ کعبہ بیٹھ گئی، عرش گر پڑا

ٹکڑے سے جدا ہیں، حال یہ ہے تن کا، ہے غضب! — اب مرحلہ ہے خنجر و گردن کا، ہے غضب!
پانی کا واں ہے کام، کہ آہن کا، ہے غضب! — اب سامنا ہے شمر سے دشمن کا، ہے غضب!
اُس کے شریکِ ذبح میں بارہ شریر ہیں
یاں اک گلا ہے، جس پہ کئی زخمِ تیر ہیں

فضہ نے جاکے خیمے میں رانڈوں کو دی خبر — "ہے ہے مرے خواجے کا کٹتا ہے تن سے سر"
بستر سے اُٹھ کے گر پڑے سجادِ نوحہ گر — خیمے سے نکلیں بی بیاں بچوں کو چھوڑ کر
گر گر کے دوڑتی تھیں، کہ مل لیں حسین سے
ہلتا تھا عرش حضرتِ زینب کے بین سے

مانندِ آفتاب لرزتا تھا جسمِ پاک — جائیں کدھر؟ وہ فوج، وہ صحرائے ہولناک
سر پر عصابہ، پاؤں میں موزے، ردا پہ خاک — لٹکے ہوئے تھے دونوں طرف پیرہن کے چاک
عابد کا نورِ عین ردا تھامے ساتھ تھا
اک ہاتھ میں یتیم سکینہ کا ہاتھ تھا

چلاتی تھی "اے مرا بھائی ہے کس طرف؟ — لوٹی ہوئی علی کی کمائی ہے کس طرف؟
دریا کدھر ہے خوں کا، ترائی ہے کس طرف؟ — سونے کی جا حسین نے پائی ہے کس طرف؟
رستہ دے اے زمیں کہ فلک کی ستائی ہوں
میں اپنے پیارے بھائی سے ملنے کو آئی ہوں

"بھیا! میں اب کہاں سے تمھیں لاؤں؟ کیا کروں؟ — کیا کہہ کے اپنے دل کو میں سمجھاؤں؟ کیا کروں؟
کس کی دُہائی دوں؟ کسے چلاؤں؟ کیا کروں؟ — بستی پرائی ہے، میں کدھر جاؤں؟ کیا کروں؟
دُنیا تمام اُجڑ گئی، ویرانہ ہو گیا
بیٹھوں کہاں، کہ گھر تو عزاخانہ ہو گیا

"اے قبرِ مصطفیٰ کے مجاور! ترے نثار　　اے بے کس و غریب مسافر! ترے نثار
اے تشنہ کام و صابر و شاکر! ترے نثار　　اے دینِ حق کے حامی و ناصر! ترے نثار
آئے تھے کربلا میں شہادت کے واسطے
اک دن میں گھر لٹا دیا امت کے واسطے"

وہ لو، وہ آفتاب کی تابندگی، وہ بن　　جھیلوں میں شیر ہانپتے تھے، دشت میں ہرن
رونے کی چار سو تھی صدا، بولتا تھا رن　　غل تھا، خدا پرستوں کے لاشے ہیں بے کفن
آندھی میں خاک اڑتی تھی گھوڑوں کی گشت سے
آواز ہائے ہائے کی آتی تھی دشت سے

بے سر جو تھا زمیں پہ یداللہ کا خلف　　ہلتا تھا کعبہ، کانپتے تھے یثرب و نجف
تھی کربلا میں خاک بسر قدسیوں کی صف　　برپا تھا شورِ ہائے حسینا، کا ہر طرف
یہ واقعہ وہ ہے، کہ خوشی ناپدید ہے
ہر سینہ کربلا ہے، ہر اک دل شہید ہے

مجاہدینِ کربلا اور اُن کا کارنامہ

کیا غازیانِ فوجِ خدا نام کر گئے! لاکھوں سے تشنہ کام لڑے کام کر گئے
بس اپنا مثلِ ابرِ کرم عام کر گئے اُمّت کی مغفرت کا سرانجام کر گئے
پڑھتے ہیں سب درود جو ذکر اُن کے ہوتے ہیں
ایسے بشر وہ تھے کہ ملک جن کو روتے ہیں

ز ار د سر فروش و شجاع و خوش اعتقاد ہاتھوں میں تیغیں اور دلوں میں خدا کی یاد
زخموں کو تخلِ قد پہ وہ سمجھے گلِ مراد مردانگی یہ پیاس میں، فاقوں میں یہ جہاد
تیغوں سے بند کون سا اُن کا کٹا نہ تھا
پر معرکے سے پاؤں کسی کا ہٹا نہ تھا

رستم اُٹھا نہ سکتا تھا سر اُن کے سامنے شیروں کے کانپتے تھے جگر اُن کے سامنے
پھیکی تھی روشنی قمر اُن کے سامنے اُڑتا تھا رنگِ روئے سحر اُن کے سامنے
بخشا تھا نورِ حق نے ہر اک خوش صفات کو
ہوتا تھا دن، جو گھر سے نکلتے تھے رات کو

شانیوں پہ جلوہ نما اخترِ سجود دیکھیں جو اُن کا نور، تو قدسی پڑھیں درود
سے عیاں جلال و جواں مردی نمود شیدائے آلِ شیفتۂ واجب الوجود
لشکر جو اُن پہ ٹوٹ پڑے شام و روم کے
تلواریں کھائیں جسم پہ کیا جھوم جھوم کے

آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ

مُصنّفہ

پروفیسر سیّد مسعود حسن رضوی ادیب

حضرتِ آزاد کی مشہور کتاب "آبِ حیات" ایک مدت سے اعتراضوں کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔ فاضل مصنّف نے قدیم مستند ماخذوں کے حوالے سے ثابت کردیا ہے کہ بیشتر اعتراضات معترضوں کی کوتاہ نظری کا نتیجہ ہیں۔ یہ چھوٹی سی کتاب اُردو کے تحقیقی اور تنقیدی ادب میں گراں قدر اضافہ ہے۔

تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۱۰۰ صفحے۔

مجلد مع گردش، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

کتاب نگر

دین دیال روڈ، لکھنؤ